1322
उर्दू संग्रह
पुस्तक का नाम पत्रिका इन्द्र
लेखक एडीटर धर्म पाल बी. ए.
प्रकाशन वर्ष - माह अप्रैल 1907
आगत संख्या 1323

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۲

حاذقی
مجلسی
جسمانی
علمی
دماغی
سوشل
روحانی
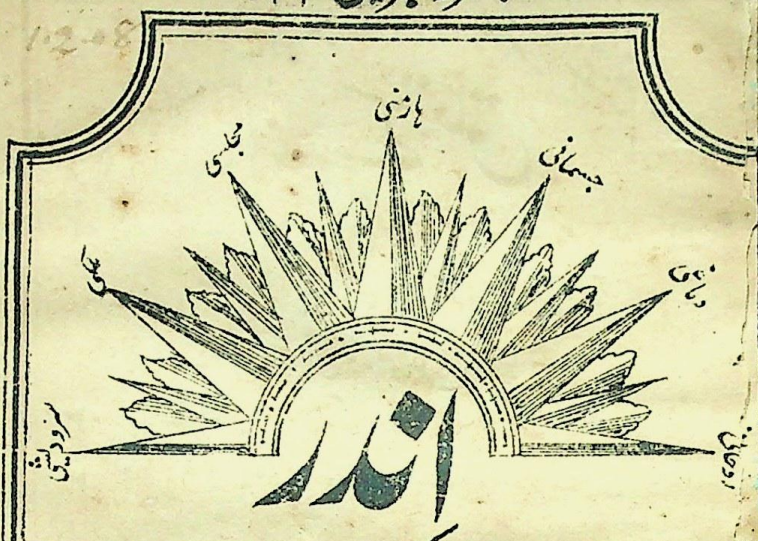
اندر

جلد دوم | اپریل سنہ ۱۹۰۷ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

صفحہ

ایڈیٹر - دھرم پال - بی - اے

پنجاب اکانومیکل پریس لاہور

قیمت سالانہ ۲ روپے ۸ آنے مع محصول ڈاک ممالک غیر ۳ روپے ۸ آنے مع محصول ڈاک

اِندر کے متعلّق

۱- اِندر ہر ایک ماہ کی دس تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ جو اصحاب پہلی یا دوسری تاریخ کو ہی یہ شکایت لکھ دیتے ہیں۔ کہ کیا وجہ ہے اندر ابھی تک نہیں ملا۔ اُن کو تاریخ یاد رکھنی چاہیئے +

۲- تبدیلئے پتہ کی اطلاع کے ساتھ چٹ کا نمبر ضرور لکھنا چاہیئے +

۳- بعض اصحاب نمبر ۳۲۳ ۵ کو ہی چٹ نمبر لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سرکار جسٹرڈ نمبر ہے +

۴- پرچہ کے گم ہونے کی اطلاع اسی ماہ میں آنی چاہیئے۔ نہ کہ ڈیڑھ ماہ بعد

۵- اندر جنوری ۱۹۰۷ء سے دوسرے سال کی مسافت طے کر رہا ہے۔ بعض اصحاب اندر کی پچھلی جلدیں طلب کر رہے ہیں اور کئی نئے خریدار جنوری ۱۹۰۶ء سے خریدار بننے کے خواہشمند ہیں۔ اُن کی آگاہی کے لئے اطلاع دی جاتی ہے۔ کہ مئی اور اگست کے نمبر بالکل نہیں رہے بقیہ مہینوں کے نمبر ۳ فی جلد کے حساب سے مل سکتے ہیں +

۶- جو گراہک اِندر کی فائل نہیں رکھتے۔ اگر وہ مئی اور اگست کے پرانے پرچے واپس کرنا چاہیں۔ تو ۳ فی پرچہ کے حساب سے خریدے جائینگے انہیں چاہیئے۔ کہ اس امر کی نسبت مینیجر سے خط و کتابت کریں +

۷- کئی وجوہات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ کہ آئندہ افریقہ نواسی بھائیوں کی خدمت میں بلا وصول پیشگی قیمت اندر جاری نہیں کیا جائیگا +

لائیکرگس رِشی کے قوانین

"آپ کے ملک میں زناکاروں کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے کیا سزا مقرر ہے؟" یہ ایک سوال تھا۔ جو کہ سپارٹا نواسی جیرادس سے اثناء بات چیت میں اُس کے ایک اجنبی مہمان نے پوچھا۔ جیرادس نے جواب دیا۔ "میرے دوست ہمارے ملک میں زناکاری ہوتی ہی نہیں"۔ اجنبی نے دوبارہ پوچھا۔ "بھلا اگر کوئی زنا کر بیٹھے۔ تو گورنمنٹ کی طرف سے اس کو کیا سزا ملتی ہے؟" جیرادس نے جواب دیا۔ "اگر کوئی زنا کر بیٹھے۔ تو گورنمنٹ اُس کا اتنا لمبا بیل جو کہ کوہ ٹیگیٹس پر کھڑا ہو کر دریائے یورٹیس سے پانی پی سکتا ہو۔ ضبط کر لیتی ہے"۔ اجنبی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "بھلا کبھی اتنا لمبا بیل بھی دنیا میں ہو سکتا ہے!!" جیرادس نے مسکرا کر کہا۔ "دوست اگر دنیا میں اتنا لمبا بیل ملنا ناممکن

ہے۔ تو سپارٹا میں زنا کاری کا ہونا بھی ناممکن ہے"۔ اجنبی اس جواب کو سنکر خاموش ہو گیا۔ مگر ہم خود حیران ہیں۔ کہ آخر سپارٹا میں کیا قوانین تھے۔ جن کی وجہ سے وہاں زنا کاری ناممکن تھی۔ ہماری یہ حیرانی فوراً دور ہو جاتی ہے۔ جب ہم سپارٹا کے مقنن لائیکرگس رشی کی زندگی اور اُس کے قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں۔ آج ہم اس مقدس انسان کا مختصر سا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارا یہ بیان زیادہ تر ہنری مورلے کی کتاب "لائیکرگس" اور انسکلوپیڈیا پر منحصر سمجھنا چاہیئے +

لائیکرگس ہرقیولیس کی چھٹی پشت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُس کا زمانہ مسیح سے ۸۹۸ برس پہلے بتایا جاتا ہے۔ اُس کے پتا کا نام یونومس تھا۔ یونومس کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام پولیڈیکٹس تھا۔ دوسری بیوی کے لڑکے کا نام لائیکرگس تھا۔ پولیڈیکٹس لائیکرگس سے عمر میں بڑا تھا۔ جب یونومس بادشاہ قتل کیا گیا۔ تو اس کا بڑا لڑکا پولیڈیکٹس اتفاق رائے سے سپارٹا کے ملک کا بادشاہ بنایا گیا۔ مگر تھوڑے دنوں کے بعد وہ بھی مر گیا۔ اب تخت کا مالک سوائے لائیکرگس کے اور کوئی نہیں تھا۔ کونسل نے اتفاق رائے سے لائیکرگس کو بادشاہ مقرر کیا۔ مگر لائیکرگس کو معلوم ہو گیا۔ کہ اُس کے بھائی کی استری گربھ وتی ہے۔ یہ جانتے ہی اُس نے تمام ملک میں اعلان کر دیا۔ کہ تخت کا حقیقی وارث پیدا ہونے والا ہے۔ اگر اولاد نرینہ ہوئی۔ تو میں تخت اُس کے حوالے کر دونگا۔ اُس وقت تک میں بطور ایک قائم مقام کے کام کرونگا۔ اور جب تک لڑکا بالغ نہ ہو جائے۔ میں اُس کا سرپرست رہونگا۔ چنانچہ کونسل نے لائیکرگس کو پروڈیکس یا سرپرست کا خطاب دیا۔ مگر جب اس کے بھائی کی استری کو اس بات کا پتہ لگا۔ تو اُس نے لائیکرگس کے پاس خفیہ پیغام بھیجا۔ کہ اگر سپارٹا کے بادشاہ بنکر تم میرے ساتھ شادی کرنے کا وعدہ کرلو۔ تو میں بچہ کو پیدا ہوتے کے ساتھ ہی مار دونگی۔ یا قبل از پیدائش اسقاط کے ذریعہ اُس کو تباہ کر دونگی۔ لائیکرگس کو عورت کی شرا

پر سخت غصہ آیا۔ مگر اُس نے یہ سوچ کر کہ اگر میں سختی سے کام لونگا۔ تو ممکن ہے۔ یہ حمل کو اسقاط کرا دے۔ اس عورت کے ساتھ نرمی سے سلوک کرنا مناسب سمجھا۔ اور اُس کو کہ دیا "میں تمہاری تجویز کے برخلاف کچھ نہیں کہتا۔ مگر فی الحال تم نے کسی قسم کی اسقاط کی دوا کا استعمال نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو۔ کہ ایسا کرنے سے تمہاری اپنی جان خطرے میں پڑ جائے۔ یا تمہاری اپنی صحت کو نقصان پہنچے۔ میں کوشش کرونگا۔ کہ بچے کو پیدا ہوتے کے ساتھ ہی تباہ کر دیا جاوے" اس بہانہ سے لائیکرگس نے اس عورت کو اپنے خوفناک منصوبہ سے باز رکھا۔ جب اُس کے دن پورے ہو گئے۔ اور لائیکرگس کو پتہ لگا۔ کہ آج بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ تو اُس نے اپنے خاص مصاحب زچہ خانہ کی طرف روانہ کئے۔ کہ وہ ہر ایک طرح کی احتیاط سے کام لیں۔ اگر لڑکی پیدا ہو۔ تو اُس کو عورتوں کے حوالہ کر دو۔ لیکن اگر لڑکا پیدا ہو۔ تو اُس کو اُسی وقت میرے پاس لے آؤ۔ خواہ میں کسی حالت میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اتفاق حسنہ سے لڑکا پیدا ہوا۔ مصاحب لڑکے کو اسی وقت لائیکرگس کے پاس لے آئے۔ لائیکرگس اُس وقت اپنے دیگر مصاحبوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اُس نے اُسی وقت لڑکے کو لیکر اپنے مصاحبوں سے مخاطب ہو کر کہا "اہل سپارٹا! دیکھو یہ تمہارا بادشاہ پیدا ہو گیا ہے"۔ یہ کہکر اُس نے بچے کو شاہی تخت پر لٹا دیا۔ اُمرا لائیکرگس کی اُدارتا اور اُس کے انصاف پر اس قدر خوش ہوئے کہ اُنہوں نے بچے کا نام ہی چاریلیس (مسرت بخش) رکھ دیا۔ پس اس طرح لائیکرگس کی حکومت کا صرف آٹھ ہی ماہ میں خاتمہ ہو گیا +

اگرچہ لائیکرگس اب سپارٹا کا بادشاہ نہیں تھا۔ مگر پھر بھی لوگ اُس کی خوبیوں کی وجہ سے دل وجان سے اُس کی عزت کرتے تھے۔ اور اس کے تمام احکام کو بجا لانے کے لئے ہر دم تیار رہتے تھے۔ ایسے لوگ بہت کم تھے۔ جو اُس کی عزت نابالغ بادشاہ کا سرپرست ہونے کی وجہ سے کرتے تھے۔

نہیں۔ بلکہ اُس کی عزت اُس کی اپنی خوبیوں کی وجہ سے تھی۔ باوجود اس کے لائیکرگس کے حاسدوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ لائیکرگس کی بھاوجہ کے رشتہ دار خصوصیت سے اس کی طرف سے بدظن رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن ملکہ کے بھائی نے برملا لائیکرگس کی ہتک کی۔ اور کہدیا۔ کہ لائیکرگس خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اُس نے یہ بات اس لئے کہی تھی۔ کہ اگر خدانخواستہ بچے کو کوئی صدمہ پہنچے۔ تو اُس کے لئے لائیکرگس کو ملزم گردانا جاوے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس کی بھاوجہ نے بھی اس کے برخلاف مختلف جوڑ توڑ لڑانے شروع کردئے لائیکرگس نے جب اپنی حالت کو ایسی شکیہ پایا۔ تو اُس نے مصمم ارادہ کرلیا۔ کہ سپارٹا کو چھوڑکر ممالک غیر کی سیاحت کرنے کے لئے نکل جانا چاہئے۔ اور جب تک لڑکا بالغ نہ ہوجاوے۔ یا جب تک لڑکے کے ہاں لڑکا پیدا نہ ہوجاوے۔ جو کہ اس کے بعد تخت کا مالک گردانا جاوے۔ مجھے سپارٹا میں ہرگز واپس نہیں آنا چاہئے +

یہ سوچکر وہ سپارٹا کو خیرباد کہکر جہاز میں روانہ ہوپڑا۔ سب سے پہلے وہ قریط کے جزیرہ میں پہنچا۔ جو کہ یونان کے جنوب میں واقع ہے۔ قریط میں گورنمنٹ کے قوانین کا اُس نے بغور مطالعہ کیا۔ اُن میں سے بہت سے قوانین اُس کو اس قدر پسند آئے۔ کہ اُس نے واپس آکر اُن کو اپنے ملک میں رائج کرنے کا ارادہ کرلیا۔ قریط میں اُس نے بہت سے دوست بھی پیدا کرلئے۔ جن میں سے تھیلس اس کا نزدیکی دوست تھا۔ لائیکرگس نے تھیلس سے درخواست کی۔ کہ وہ سپارٹا میں جاکر سکونت اختیار کرے۔ تھیلس اپنی مدبری کے لئے بڑا مشہور تھا۔ ساتھ ہی وہ شاعر بھی تھا۔ وہ اپنی دلسوز غزلوں سے سامعین کو اپنا اس قدر گرویدہ کرلیتا تھا۔ کہ جس قسم کا قانون وہ ملک میں جاری کروانا چاہتا تھا۔ وہی جاری ہوجاتا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ لائیکرگس نے اُس کو سپارٹا میں جانے کی درخواست کی تھی۔ قریط سے روانہ ہوکر لائیکرگس مصر میں سے ہوتا ہؤا ایشیا

کے بعض ممالک کی دیکھ بھال کرتا ہؤا آریہ ورت میں پہنچا۔ اور یہاں کے قوانین کو بغور مطالعہ کیا۔ تپسوئی سادھوؤں اور سنیاسیوں کی سادہ زندگی اور اُن کی ریاضت نے اس کے دل پر ایک گہرا اثر کیا۔ باوجودیکہ آریہ ورت اُس وقت بہت پستی کو پہنچ چکا تھا۔ مگر پھر بھی بڑے برتن کی کُھرچن کے طور پر ابھی تک اس میں اس قدر مصالح موجود تھا۔ کہ لائیکرگس اس سے خاص سبق سیکھ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ جس وقت لائیکرگس آریہ ورت میں آیا۔ اور اُس کی آمد کا زمانہ بدھ مت کے ظہور سے بہت پہلے بتایا جاتا ہے۔ اس وقت بھی آریہ ورت میں پراچین طریقہ تعلیم یعنی گورُوکل سسٹم ٹوٹی پھوٹی حالت میں موجود تھا۔ علاوہ ازیں استریوں کی حالت ایسی ردّی ہرگز نہیں تھی جیسی کہ مابعد کے زمانہ میں ہوگئی۔ سوئمبر وواہ کا دستور ابھی تک باقی چلا جاتا تھا۔ لائیکرگس نے ان تمام باتوں کو اپنے ملک کی بہبودی کے لئے ضروری سمجھا۔ قریط۔ سپین۔ مصر۔ لیبیا اور آریہ ورت میں آکر جو جو تجربات اس کو حاصل ہوئے تھے۔ اُس نے ان سب کو ملا جُلا کر سپارٹا کے لئے معجون مرکب بنانے کا وچار کیا ٭

ادھر جبکہ لائیکرگس سپارٹا سے غیر حاضر دوسرے ملکوں کی سیر کرنے میں مشغول تھا۔ سپارٹا میں بدامنی پھیل گئی۔ بادشاہ بالکل خوردسال اور سادہ لوح تھا۔ اراکین سلطنت نے لائیکرگس کی تلاش میں چاروں طرف ایلچی روانہ کئے۔ جب اُن کو لائیکرگس کا پتہ لگ گیا۔ تو اُنہوں نے بڑی عاجزی اور انکساری سے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کی۔ کہ ملک تباہ ہو رہا ہے۔ آپ چل کر اُس کی خبر لیجئے۔ لائیکرگس سپارٹا میں واپس آیا۔ اور سیدھا ڈلفی دیوی کے مندر میں پہنچا۔ وہاں جا کر اُس نے پرارتھنا کی۔ کہ جن قوانین کو میں ملک میں مروج کرنا چاہتا ہوں۔ آپ آشیرباد کریں۔ کہ مجھے اُن میں کامیابی ہو۔ "اے دیوتاؤں کے پسندیدہ بلکہ خود دیوتا لائیکرگس!! آپولو کا

آشیرباد تمہارے ساتھ ہے۔ تم اپنے قوانین ملک میں جاری کرو۔ تم کو ہر طرح سے کامیابی ہوگی۔ اور تمہارے قوانین دنیا میں تمام قوانین سے افضل ثابت ہونگے"۔ لائیکرگس اس آشیرباد کو پاکر شہر میں واپس آیا۔ اور اراکین دربار سے ملک کے بارے میں رپورٹ سن کر اُس نے سوچا۔ کہ چند تغیرات کر دینے سے ملک کبھی بھی سُدھر نہیں سکتا۔ ضرورت ہے کہ اس میں بنیادی تبدیلیاں کی جاویں۔ اور اُس کے تختہ کو سرے سے ہی پلٹ دیا جاوے۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا۔ کہ اس وقت کیا کرنا چاہئیے۔ دوستوں نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا۔ کہ آپ کے ساتھ سر دینے کے لئے تیار ہیں۔ آپ جو تبدیلیاں کرنی چاہتے ہیں۔ کریں۔ جب دوستوں کی طرف سے اُس کو اطمینان ہوگیا۔ تو اُس نے شہر کے تیس بارسوخ آدمیوں کو اپنے پاس مسلّح ہوکر آنے کے لئے حکم دیا۔ جب وہ آگئے۔ تو اُس نے کہا۔ کہ تم میرے ساتھ رہو۔ میں اپنے قوانین اہل شہر کے سامنے پیش کرونگا۔ اگر کوئی اُن میں سے چون و چرا کرے۔ یا اُن سے سر پھیرنے کی خواہش کرے۔ تو اُس کو فوراً گرفتار کر کے جیل خانہ میں بھیجدو۔ اس مسلح دستہ کو ساتھ لیکر اُس نے شہر کے بڑے بڑے آدمیوں اور امرا و وزرا کے سامنے اپنے ان قوانین کو پیش کیا۔ جو کہ وہ ملک میں مروج کرنا چاہتا تھا۔ بڑی گڑبڑ مچ گئی۔ بادشاہ بھی اس قدر دہشت زدہ ہوگیا۔ کہ وہ قلعہ میں جاکر چھپ گیا۔ کیونکہ مسلح دستہ کو دیکھ کر اُس نے جی میں خیال کیا۔ کہ یہ سب سازش مجھے گرفتار کرنے کے لئے ہے۔ لیکن جب اُس کو بعد میں پتہ لگا۔ کہ معاملہ اصل میں کیا ہے۔ تو وہ خود بھی لائیکرگس کے ساتھ ہوکر اُن قوانین کی تائید و ترویج میں مشغول ہوگیا۔ یہ پہلی فتح تھی جو کہ لائیکرگس کو نصیب ہوئی +

جب وہ اہل شہر پر اس طرح سے رعب و داب قائم کر چکا۔ تو اُس نے آہستہ آہستہ اپنے قوانین کو جاری کرنا شروع کیا۔ اُس نے پہلا قانون

یہ بنایا - کہ رعایا اور بادشاہ کے درمیان رشتۂ الفت بڑھانے اور مناسب طریقہ پر انصاف کئے جانے کے لئے ایک ایسی کونسل کی ضرورت ہے جس میں رعایا کی طرف سے چُنے ہوئے ممبر ہوں - جن کا فرض علاوہ دیگر فرائض کے ایک یہ بھی ہو - کہ وہ نہ تو بادشاہ کو ہی اس قدر خود مختار ہونے دیں - کہ وہ رعایا پر من مانی سختیاں کرنے لگ جاوے - نہ ہی رعایا کو اس قدر گستاخ بننے دیں - کہ وہ بادشاہ کو دبا لے - بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال قائم رکھیں - اس مطلب کے لئے اُس نے ۲۸ ممبر چُنے - بادشاہ کو بھی اُن میں شامل کر لیا - یہ ایک قسم کی پارلیمنٹ تھی - جب یہ پارلیمنٹ بن چکی - تو اُس نے دیگر اصلاحات کی طرف توجہ کی - اُس نے دیکھا - کہ سپارٹا میں دو قسم کے آدمی ہیں - ایک تو وہ جو بڑی بڑی زمینوں کے مالک اور دولتمند بنے بیٹھے ہیں - دوسرے وہ جو بالکل مفلس ہیں - نہ اُن کے پاس زمین ہے - نہ روپیہ - لائیکرگس نے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پیدا کرنے کے لئے یہ قانون پاس کر دیا - کہ سپارٹا میں جس قدر زمین ہے - وہ اُس کے باشندوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دی جاوے - یہ کام بڑا مشکل تھا - کیونکہ جن لوگوں کے پاس زمین زیادہ تھی - وہ اپنے قبضہ کو چھنتا دیکھ کر بغاوت کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے - مگر لائیکرگس اور پارلیمنٹ کا رعب اس قدر بیٹھا ہوا تھا - کہ کوئی شخص بھی آگے سے چوں چرا نہیں کر سکتا تھا - فوراً قانون پر عمل درآمد کیا گیا - اور زمین کے ۳۹ ہزار مساوی حصّے کر دئے گئے - اور اسی قدر گھرانوں میں تقسیم کر دئے گئے - اس طرح لائیکرگس نے امیروں کو زیادہ امیر اور غریبوں کو دن بدن غریب ہوتے جانے کی وبا سے بچا کر اعتدال قائم کر دیا لیکن لائیکرگس صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا تھا - بلکہ اُس نے جائداد منقولہ کو بھی برابر حصّوں میں تقسیم کر دینے کا ارادہ کیا - یہ ایک بڑا خطرناک کام تھا - کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے اندوختہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دوسرے

کے ہاتھوں میں جاتے دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ لائیکرگس کی اس اصلاح پر حد سے زیادہ شور شرابہ مچا۔ مگر لائیکرگس نے اس کے لئے ایک اور ہی ترکیب نکال لی۔ جس سے یہ کام بڑی آسانی سے پورا ہوگیا۔ وہ یہ کہ اُس نے بجائے سونے اور چاندی کے سکّوں کے لوہے کا سکّہ جاری کر دیا۔ لوہے کے روپے اور لوہے کی اشرفیاں!! لوہے کے بڑے ڈھیر کی قیمت بھی نام مات ہی رکھّی۔ یہاں تک کہ دس من لوہے کی قیمت تو بالکل ہی تھوڑی ہوتی تھی۔ مگر اُس کو جمع کرنے کے لئے گھر کے اندر ایک خاص کمرے کی ضرورت پڑتی تھی۔ کوئی کہاں تک لوہے کا ڈھیر گھر میں جمع کرسکتا تھا۔ سونے اور چاندی کی اشرفیاں اور روپیہ تو ایک کونے میں ہزاروں کی قیمت کے رکھے جاسکتے تھے۔ مگر لوہے کے لئے وسیع اور عظیم الشان خزانوں کی ضرورت تھی۔ اس قانون کا فائدہ یہ ہوا۔ کہ اوّل تو جو لوگ اپنے پاس سونا چاندی جمع کئے بیٹھے تھے۔ اور اُس کو وہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُن کا تمام سونا چاندی نکمّا ہوگیا۔ کیونکہ گورنمنٹ سونے چاندی کے روپیوں اشرفیوں کو کوڑی کے مول کا بھی نہیں گردانتی تھی۔ پس اس طرح دولت مندوں کے سر کو جو کہ دولت کے زعم میں اپنے مفلس بھائیوں کو ساڑا کرتے تھے۔ نیچا کر دیا گیا اور وہ سب ایک ہی سطح پر آ گئے۔ روپے کے لحاظ سے بڑے چھوٹے کی جو تمیز تھی۔ وہ یک لخت جاتی رہی۔ دوسرے چوری کا قطعی انسداد ہوگیا۔ کیونکہ چور اگر کسی کے گھر میں نقب لگاتا بھی تو کس چیز کے لئے؟ کیا لوہے کے ٹکڑوں کے لئے جن میں سے اگر وہ دس بارہ من اُڑا بھی لے جاتا۔ تو بھی اس کے پلّے چند پیسے ہی پڑتے۔ نیز چوری کے مال کو لے جانا اور چھپانا بھی تو اس کے لئے کارے دارد کا معاملہ ہوجاتا۔ تیسرے رشوت ستانی کا دروازہ قطعی بند ہوگیا۔ کوئی حاکم اپنے ماتحتوں سے رشوت نہیں لے سکتا تھا۔ اگر وہ لے تو فوراً پکڑا جاوے۔ کیونکہ روپیہ یا اشرفی تو جھٹ جیب میں ڈال لیا جاتا تھا

مگر لوہے کے روپے یا بالفاظ دیگر لوہے کے بٹّے کون جیب میں ڈالتا پھرتا خاص کر جبکہ وہ توڑ کر چھوٹے بھی نہیں کئے جا سکتے تھے۔ توڑنے سے وہ بالکل ردّی ہو جاتے تھے۔ کیونکہ جب لوہے کے روپے بنائے جاتے تھے۔ تو اُن کو سرخ کر کے سرکے میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ تاکہ اُن پر آب آجاوے۔ اور کسی دوسرے کام میں توڑ پھوڑ کر استعمال نہ کئے جا سکیں۔ چوتھا فائدہ اس سے یہ ہوا۔ کہ ملک میں غیر ضروری پیشوں کی توبیخ کنی ہو گئی۔ اور ضروری پیشے باقی رہ گئے۔ اور ملک میں وہ چیزیں جو کہ زندگی کے لئے زیادہ ضروری ہیں۔ کثرت سے بننے لگ گئیں۔ سپارٹا والے سامان معیشت کے لئے دوسرے ممالک کے پنجے سے قطعی آزاد ہو گئے۔ کیونکہ تمام ممالک خاصکر یونان کے لوگ تو سپارٹا والوں کے سکّے پر تمسخول اڑاتے تھے۔ کہاں تو پہلے غیر ممالک کے جہاز اسباب تجارت سے بھرے ہوئے آتے رہتے تھے۔ کہاں اب اس نئے سکّے کے جاری ہو جانے سے ایک جہاز بھی اُن کے بندرگاہوں میں نہیں پھٹکتا تھا۔ کیونکہ سوداگر لوگ لوہے کے روپے کے چنداں خواہشمند نہیں تھے۔ پس اس طرح سپارٹا والوں کا رشتہ تجارت دیگر ممالک سے قطعی ٹوٹ گیا۔ جب دیگر ممالک کی ہر ایک چیز سپارٹا میں آنی بند ہو گئی۔ تو سپارٹا والوں کو ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا خود بخود فکر پڑ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ملک میں عمدہ سے عمدہ میز۔ کرسی۔ بچھونے۔ برتن۔ جھاڑ فانوس وغیرہ بننے لگ گئے۔ کہاں تو سپارٹا والے عیش و عشرت کے پتلے تھے۔ کہاں اب وہ اس قدر محنت کش اور جفاکش بن گئے۔ کہ ہر ایک چیز اپنے ہاتھوں سے بنانے لگ گئے۔

مذکورہ بالا دو اصلاحوں کے علاوہ لائیکرگس نے تیسری اصلاح اور کی۔ وہ ان دونوں کے ہم پایہ تھی۔ لائیکرگس عیاشی اور آرام کی زندگی بسر کرنے کا سخت دشمن تھا۔ چونکہ سپارٹا اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے کمزور

ہوتا جارہا تھا۔ اور دشمنوں نے اُس کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اس لئے وہ سپارٹا کی نجات اسی میں سمجھتا تھا۔ کہ جہاں تک ہو سکے۔ لوگ آرام کی زندگی کو خیر باد کہکر جفاکش بنیں۔ ایک دوسرے کو دولت کی وجہ سے نیچا یا اُونچا نہ سمجھیں۔ بلکہ اوصاف کی وجہ سے ایسا کریں۔ اس پہلو میں زیادہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس نے تیسری اصلاح "پریتی بھوجن" کی شروع کی۔ "پریتی بھوجن" گورنمنٹ کی طرف سے قانوناً جاری کیا گیا۔ شہر کے تمام آدمیوں کو بلاتمیز اس کے کہ وہ امیر ہیں یا غریب دونوں وقت بھوجن کے لئے ٹاؤن ہال میں جمع ہونا پڑتا تھا۔ جہاں سب کے سب ایک ہی قسم کا بھوجن پاتے تھے۔ یہ قانون تھا کہ کوئی شخص بھی اپنے گھر میں گوشت یا دوسری قسم کے لذیذ کھانے نہ کھاوے۔ کیونکہ گھروں میں باورچیوں یا قصابوں کی مدد سے درندوں کی طرح مانس کھا کھا کر اپنے آپ کو موٹا کرنا لائیکرگس کے نزدیک نہ صرف مکروہ اور اخلاق کو بگاڑنے کا ذریعہ تھا۔ بلکہ اس سے جسم کا تناسب بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ لائیکرگس کے نزدیک اس قسم کی خوراک انسانوں کو عیّاش اور شہوت پرست بنانے کے علاوہ کاہل اور آرام طلب بھی بنا دیتی تھی۔ اور وہ لمبی لمبی نیند۔ نرم نرم بستروں۔ گرم پانی سے نہانے کے خواہشمند ہو جاتے تھے۔ ان تمام باتوں کے انسداد کرنے کے لئے ہی اُس نے پریتی بھوجن کا طریقہ جاری کیا تھا۔ لائیکرگس دبی آنکھوں سے ہر ایک شخص کو تاڑتا رہتا تھا۔ کہ آیا وہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہے یا روکھی پھیکی خوراک پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اگر اُس کو کوئی اس قسم کا آدمی نظر پڑ جاتا تھا۔ تو وہ دوسرے لوگوں کو اُس کی طرف متوجہ کر کے شرمندہ کرتا تھا۔ کہ دیکھو یہ گھر میں لذیذ کھانوں کا غلام اور بے اعتدالی کی زندگی بسر کرنے کا شوقین کیسے منہ بنا رہا ہے۔ باقی کے لوگ بھی اس کو زن مرید کہکر مخول اڑاتے تھے۔ یہاں تک کہ اس غریب کا ناک میں دم آجاتا تھا۔ اور

وہ آئندہ کوشش کرتا تھا۔ کہ "پریتی بھوجن" میں دوسرے لوگوں کی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھاوے۔ اور گھر میں کسی قسم کی بے اعتدالی نہ کرے۔ لیکن لائیکرگس کا یہ قانون امیروں کو اس کے تمام قوانین سے بڑھکر گران معلوم ہوتا تھا۔ وہ "پریتی بھوجن" میں شامل ہونا اپنے لئے باعث ہتک سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس بات سے وہ اس قدر آزردہ ہو گئے۔ کہ انہوں نے لائیکرگس کو جان سے مار ڈالنے کا قصد کر لیا۔ جب وہ اس پر حملہ کرنے دوڑے۔ تو وہ اِن کے سامنے سے بھاگ کر ایک مندر میں جا چھپا۔ مگر بدقسمتی سے مندر میں ایک الکنڈر نامی دل جلا نوجوان پہلے سے ہی موجود تھا۔ اُس نے ایک لٹھ اُٹھا کر لائیکرگس کے رسید کیا اور اُس کی آنکھ پھوڑ ڈالی۔ لائیکرگس کا چہرہ اور اُس کے کپڑے خون سے آلودہ تھے۔ وہ اپنی مضروب آنکھ کے ساتھ اہل شہر کے سامنے آیا۔ اور کہنے لگا۔ دوستو! میں آپ کے اس سلوک پر آزردہ نہیں ہؤا ہوں۔ نہ ہی خفا ہؤا ہوں۔ اہل شہر جو لائیکرگس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ لیکن جب اُنہوں نے اُس کی یہ حالت دیکھی۔ تو سب نے مارے شرم کے سر جھکا لئے۔ اور نہایت ہی سخت افسوس کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے الکنڈر کو پکڑ کر لائیکرگس کے حوالہ کر دیا۔ کہ آپ اس کو جو سزا دینا چاہیں۔ دیں اور لائیکرگس کو بڑی عزت اور دھوم دھام سے اپنے گھر لے گئے۔ لائیکرگس نے اُن کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ مگر الکنڈر کو جس نے کہ اُس کی آنکھ پھوڑی تھی اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اور اُس کے ساتھ برادرانہ سلوک کیا۔ الکنڈر نے جب لائیکرگس کی مہربانیوں کو دیکھا۔ تو وہ اس قدر شرمندہ ہؤا کہ اُس نے تمام اہل شہر کے سامنے اپنے پاپ کا اقرار کرتے ہوئے کہا۔ کہ میں نے مہاپاپ کیا۔ جو لائیکرگس جیسے دھرماتما کو نقصان پہنچایا۔ لائیکرگس ہماری بہبودی چاہتا ہے۔ ہم اس کو مغرور سمجھتے ہیں۔ لیکن در اصل وہ مغرور نہیں ہے۔ دشمن کے منہ سے ان کلمات کا نکلنا لائیکرگس کے لئے ایک عظیم الشان

فتح تھی۔ یہ ایک سخت انتقام تھا۔ جو کہ لائیکرگس اُس نوجوان سے لے سکتا تھا
اہل سپارٹا پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہؤا۔ کہ اُن سب نے قسم کھالی۔ کہ آئندہ
کسی جلسہ میں شامل ہوتے وقت ہم کبھی بھی چھڑی ساتھ نہیں رکھا کرینگے
"پریتی بھوجن" کا یہ طریقہ بہت زمانہ تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب
سپارٹا کے ایک بادشاہ اگیس اہل اتھنز کو فتح کر کے سپارٹا میں واپس آیا۔
اور اُس نے "پریتی بھوجن" کے ایمن سے درخواست کی۔ کہ آج میں فتح کی
خوشی میں اپنی بیوی کے ساتھ بھوجن پانا چاہتا ہوں۔ میرے حصہ کا بھوجن
گھر میں ہی بھیجدیجئے۔ تو ایمن نے صاف انکار کر دیا۔ کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔
آپ سب بھائیوں کے ساتھ مل کر ٹاون ہال میں بھوجن کیجئے۔ شاہ اگیس
کو اس انکار پر غصہ آیا۔ اور اُس نے "پریتی بھوجن" میں جانے سے انکار کر دیا۔
کونسل نے بادشاہ کی اس گستاخی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اس پر جرمانہ
کیا۔ یہ سپرٹ تھی۔ جو کہ لائیکرگس کے قوانین نے لوگوں میں پھونک دی تھی۔
امیر و غریب۔ شاہ و گدا سب ایک دوسرے کو بھراتری بھاؤ سے دیکھتے تھے۔
اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کھانا پینا۔ اٹھنا بیٹھنا رشتہ اخوت کو
مضبوط کرنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ جو ایسا نہیں کرتا تھا۔ وہ خواہ بادشاہ
بھی کیوں نہ ہو۔ لائیکرگس کے قوانین کے مطابق ملک کا دشمن اور مستوجب
سزا گردانا جاتا تھا۔ "پریتی بھوجن" میں استریاں شامل نہیں ہؤا کرتی تھیں
ہاں بچوں کو شامل ہونے کی اجازت تھی۔ "بھوجن" کے وقت۔ پہلے اور پیچھے
ہر ایک شخص کو اجازت ہوتی تھی۔ کہ وہ زود وش دل لگی کرے۔ آپس میں لطیفے
بازی ہوا کرتی تھی۔ مگر اُن کے لطیفے پاکیزگی کو لئے ہوئے ہوتے تھے۔ جو شخص
مذاق کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ اُن میں بدھو خیال کیا جاتا تھا۔ لائیکرگس
لوگوں کو بت بنانا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ اُن کو زندہ دل رکھنے والے زندہ انسان
بنانے کے درپے تھا۔ سادہ بھوجن کے علاوہ اُس نے سادہ ہی مکانات میں

رہنے پر زور دیا۔ کیونکہ وہ آرام طلبی کی زندگی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور جانتا تھا۔ کہ جو لوگ ریشم اور کمخواب کے گدیلوں پر لوٹتے ہوں۔ وہ کبھی بھی جفاکش نہیں ہو سکتے۔ پس اُس نے قانون جاری کر دیا۔ کہ ہر ایک شخص اپنے مکان کو ان دو چیزوں کے ساتھ سجائے۔ اول چھت پر جھاڑ فانوس لٹکانے یا دیگر اشیاء سے چھت کو مزین کرنے کی بجائے چھت کی زیبائش "کلہاڑی" سے کرے۔ یعنی اگر وہ اپنے مکان کو سجانا ہی چاہتا ہے۔ تو وہ "کلہاڑیاں" لٹکا کر سجائے۔ اور اگر وہ دروازے کو سجانا چاہتا ہو تو دونوں طرف "آرہ" باندھ سکتا ہے۔ اور بس! سپارٹا والوں کو مکانات کی زیبائش کے لئے "کلہاڑی" اور "آرہ" کافی ہیں۔ اس سے زیادہ زیبائش قانوناً فضول خرچی تصور کی جاویگی۔ اور قابل مواخذہ ہوگی۔ لائیکرگس نے یہ بھدا پن اس لئے جاری کیا تھا۔ کہ جب مکانات اس قسم کے بھدے ہونگے۔ تو کوئی شخص بھی ان میں ریشم و کمخواب کے نرم نرم گدیلے بچھانا پسند نہیں کریگا۔ جب لوگ نرم بستروں سے نجات پا جائینگے۔ تو وہ خود ہی جفاکش اور جسمانی لحاظ سے سڈول ہو جائینگے۔ لائیکرگس کا یہ قانون اس قدر کامیاب ہوا۔ کہ چند نسلوں کے بعد سپارٹا کے لوگ عیاشی کے تمام سامانوں کو قطعی بھول گئے۔ یہاں تک کہ جب سپارٹا کا ایک شخص "کارنتھ" میں گیا تو وہ اپنے میزبان کے مکان کی چھت کو خوبصورت تختوں سے پٹا ہوا اور کمرے کو لکڑی کے خوبصورت سامان سے سجا ہوا دیکھ کر حیرانی سے پوچھنے لگا کہ "کیا آپ کے ملک میں درخت اس قسم کے گھڑے گھڑائے مستطیل و مربع پیدا ہوا کرتے ہیں؟" یہاں تک تو اُن کی سادگی تھی۔ مگر جسمانی صحت و تندرستی کے لحاظ سے اور دماغی ترقی کے لحاظ سے وہ یونان کی کسی بھی ریاست سے پیچھے رہے ہوئے نہیں تھے۔ وہ میدان جنگ کے دھنی تھے۔ یہی زبردست تربیت تھی جس کی وجہ سے چند ہزار سپارٹن سپاہیوں نے فارس

کے اردشیر گشتاسپ کی پانچ لاکھ فوج کا منہ توڑ دیا تھا۔ جنگ کے بارے میں لائیکرگس نے یہ خاص قانون بنا چھوڑا تھا۔ کہ ایک ہی دشمن سے بار بار جنگ نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے دشمن ہماری طاقت کے رازوں سے واقف ہو جائیگا۔ اور وہ ہمارے ہی ہتھیاروں سے ہم کو پسپا کر سکیگا۔ جب تک اہل سپارٹا نے اس قانون پر عمل کیا۔ وہ فتح پاتے رہے۔ مگر جب شاہ اجی سائلس نے اہل تھیبا کے ساتھ متواتر جنگ کرنے شروع کئے۔ تو اُس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سائلس نے شکست کھائی۔ ایک فلاسفر نے جو کہ زخمی بادشاہ کے سرہانے کھڑا تھا۔ بادشاہ کو کہا "اہل تھیبا نے آپ کو اچھا انعام دیا ہے۔ وہ لڑنا تک نہیں جانتے تھے۔ مگر آپ نے اُن کو سپاہی بنا دیا۔ اور یہ اس کی سزا ہے۔ جو آپ کو ملی ہے"!

اِن تمام قوانین سے بڑھ کر لائیکرگس نے جو قوانین بچوں کی تعلیم و تربیت بیاہ شادی وغیرہ کے بارے میں مقرر کئے تھے۔ وہ بہت ہی عجیب اور بعض صورتوں میں نہایت ہی قابل تعریف تھے۔ لائیکرگس کا خیال تھا۔ اور اُس کا یہ خیال بالکل ٹھیک تھا۔ کہ بچے ماں باپ کی نہیں بلکہ ملک کی جائداد ہیں۔ جو والدین کمزور بچے پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نہیں بلکہ ملک کو تباہ کرنے کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ گورنمنٹ ملک کو پورا حق حاصل ہے۔ کہ وہ ملک کو اس قسم کی تباہی سے بچانے کے لئے ایسے قوانین جاری کرے جن پر عمل درآمد کرنے سے اہالئے ملک تندرست۔ صحیح الجسم اور توانا بچے پیدا کر سکیں۔ لائیکرگس ارد گرد کے ممالک کی گری ہوئی حالت کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔ کہ یہ لوگ گھوڑوں اور کتوں کی نسلوں کو عمدہ سے عمدہ بنانے میں مشغول ہیں۔ مگر انسان کی نسل کو عمدہ بنانے میں ان کو سخت شرم آتی ہے۔ ان کی یہ شرم خلاف فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہ لوگ زناکاری کے مرتکب ہو کر انسانی نسل کو دن بدن نیچے سے نیچے لیجا رہے ہیں۔ لائیکرگس

نے اپنے ملک کو اس پلیگ سے محفوظ رکھنے کے لئے عین اُس کی جڑ پر کلہاڑا مارا۔ اور اس کے سرچشمہ کو ہی روکا۔ اُس نے سوچا۔ کہ جب تک بچوں کی تربیت بچوں کی پیدائش سے بہت عرصہ پہلے نہ کی جاویگی۔ ملک کبھی بھی سر نہیں اٹھا سکیگا۔ پس اُس نے قانون جاری کر دیا۔ کہ سپارٹا کے بچوں کی تربیت اُس وقت سے پہلے شروع ہونی چاہئے۔ جبکہ وہ ابھی ماتا کے گربھ میں بھی نہ آئے ہوں۔ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اصلیت یہی ہے۔ لائیکرگس کا خیال تھا۔ اور اُس کا یہ خیال مابعد کے بڑے آدمیوں سے تائید کیا گیا ہے۔ کہ بچہ ماتا کا پرتی روپ ہوتا ہے۔ اگر ماتا تربیت یافتہ نہیں ہے۔ تو بچے کے بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ جو شخص لڑکی کی کماحقہ تربیت کرتا ہے۔ وہ گویا آنے والی نسل کو تعلیم دے رہا ہے۔ لائیکرگس نے لڑکیوں کی تربیت کو ویسا ہی مقدم سمجھا۔ جیسا کہ نوجوانوں کی تربیت کو وہ ضروری جانتا تھا۔ سپارٹا کے نوجوان سپارٹا کے محافظ تھے۔ مگر ان محافظوں کی محافظہ اُن کی ماتائیں تھیں۔ سپارٹا ان ہی ماتاؤں کے سر پر قائم تھا۔ لائیکرگس نے عمدہ ماتائیں اور عمدہ بچے پیدا کرنے کے لئے جو جو قوانین جاری کئے۔ اُن میں سے بعض بادی النظر میں بہت بھدے بلکہ قابل اعتراض دکھائی دینگے۔ لیکن دنیا میں کوئی کام قابل اعتراض نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اُس کا نتیجہ قابل اعتراض نہ ہو۔ لائیکرگس نے جس مقصد کو مدنظر رکھا تھا۔ اس میں اُس کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور کامیابی ہونی لازمی تھی۔ لائیکرگس نے لڑکوں کی تربیت کے لئے کیا کیا قاعدے باندھے تھے۔ کیونکہ اُن کے لئے تیس سال تک برھمچریہ کے سخت سے سخت قواعد کی پابندی لازمی رکھی گئی تھی۔ اس کا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے۔ فی الحال یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ استری جاتی کے لئے اُس نے کن قواعد کی پابندی لازمی قرار دی تھی۔ اس کا حکم تھا۔ اور اُس کا حکم قانون تھا۔ کہ کوئی لڑکی

پردے میں نہ رکھی جاوے۔ بلکہ لڑکیوں کے لئے کھیل۔ کود۔ دوڑ دھوپ کشتی۔ گولہ پھینکنا وغیرہ وغیرہ کھیلیں لازمی تھیں۔ کیونکہ لائیکرگس کے خیال میں جو کہ ایک قدرتی خیال تھا۔ جن لڑکیوں کے جسم مضبوط نہیں ہوتے۔ وہ تندرست و توانا بچے پیدا نہیں کر سکتیں۔ قدرت نے قدرتی حالت میں کسی بھی بچہ دینے والے وجود کے لئے دردزہ مقرر نہیں کیا۔ جو عورتیں دردزہ سے تکلیف اُٹھاتی ہیں۔ وہ اس بات کا ثبوت دیتی ہیں۔ کہ اُنہوں نے اپنے جسم کے لئے قوانین قدرت کی پرواہ نہیں کی۔ اور حفظ صحت کے قوانین کو مدنظر نہیں رکھا۔ جو عورتیں گھروں میں قید رہتی ہیں جو ورزش نہیں کرتیں۔ جن کو نرم نرم گدیلوں پر لیٹنے سے محبت اور سخت کام کرنے سے نفرت ہوتی ہے۔ جو کسی بھی کھردرے کام کو اپنے لئے باعث ہتک سمجھتی ہیں۔ وہی عورتیں ہوتی ہیں۔ جو زچگی کی حالت میں زیادہ دُکھ اور تکلیف اُٹھاتی ہیں۔ لائیکرگس نے لڑکیوں کے لئے جسمانی ورزشوں کا قانون پاس کر کے اس بُرائی کا بہت کچھ انسداد کر دیا۔ لیکن اُس نے اسی پر بس نہیں کی۔ بلکہ قانون کو یہاں تک سخت کر دیا۔ کہ خاص خاص موقعوں پر خاص خاص مردوں اور عورتوں کی کونسل کے سامنے لڑکیوں کے جسم کی پرداخت ہوتی تھی۔ جن لڑکیوں کے جسم سڈول ہوتے تھے۔ جن کی صحت ٹھیک ہوتی تھی۔ اُن کی تعریف کی جاتی تھی۔ برعکس اس کے جو لڑکی دُبلی پتلی کمزور نظر آتی تھی۔ اُس کو شرم دلانے کے لئے سب کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ آیندہ اپنے جسم کو ٹھیک کر سکے۔ اور اپنی دوسری بہنوں کی طرح کونسل کی پرشنسا حاصل کر سکے۔ لڑکیوں کی اس قسم کی پرداخت کرتے وقت نہایت ہی سنجیدگی اور تہذیب سے کام لیا جاتا تھا۔ کسی قسم کا تہذیب سے گرا ہوا لفظ یا اشارہ استعمال کرنا قانون کی زد میں آنا ہوتا تھا۔ لڑکوں کے اجسام کی پریکشا یا پرداخت

بھی اس طریقہ سے ہوتی تھی۔ بعض اوقات جن لڑکوں اور جن لڑکیوں کی تعلیم کا زمانہ ختم ہوچکا ہوتا تھا۔ اُن سب کو کونسل کے سامنے لایا جاتا تھا۔ اور اُن کے جسموں کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ جن لڑکوں کے جسم سڈول ہوتے تھے۔ لیڈیز کی طرف سے اُن کو خاص چیز دئے جاتے تھے۔ یہ چیز اُن کے لئے ازحد حوصلہ افزا ہوتے تھے۔ برعکس اس کے جس لڑکے کو لیڈیز کی طرف سے جھاڑ پڑتی تھی وہ اپنے آپ کو زندہ درگور سمجھتا تھا۔ اس پرداخت کا ایک نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ اور اسی نتیجہ کو حاصل کرنے کے لئے تعلیم سے فارغ شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کو کونسل کے سامنے جانچا جاتا تھا۔ کہ جس جس کے گُن کرم سوبھاؤ مل جاتے تھے۔ یا جو لڑکی جس لڑکے کو یا جو لڑکا جس لڑکی کو اپنے گن کرم سوبھاؤ کے مطابق دیکھتا تھا۔ اُن دونوں کی باہمی شادی کا انتظام ہوجاتا تھا۔ ہر ایک سپارٹن کے لئے شادی قانوناً لازمی رکھی گئی تھی یہاں تک کہ اگر کوئی نوجوان شادی کرنے سے انکار کردیتا تھا۔ تو اُس کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور اُس کے چال چلن پر کوئی نہ کوئی دھبا لگا دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ شادی کرنے کے لئے مجبور ہوجاوے۔ اگر یہ چال بھی بےسود ثابت ہوتی تھی۔ تو شہر کا مجسٹریٹ اُس نوجوان کو سردی کے موسم میں ننگا کرکے شہر کے گلی کوچوں میں تشہیر کروانے کا حکم دیدیتا تھا۔ نہ صرف تشہیر ہی بلکہ نوجوان کو اپنی ہی مذمت میں کچھ اشعار پڑھنے کے لئے بھی مجبور کیا جاتا تھا۔ جن کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ کہ چونکہ میں نے قانون کی پرواہ نہیں کی۔ اس لئے مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ اگر یہ سزا بھی ناکافی ثابت ہوتی تھی۔ تو وہ نوجوان کسی عزت کا مستحق نہیں رہتا تھا۔ خواہ وہ کسی بھی پوزیشن کو حاصل کیوں نہیں کرلیتا تھا۔ ڈرسی لائیڈس گو فوج کا کمانڈر نچیف تھا۔ مگر کنوارا رہنے کی وجہ سے نوجوان اُس کی عزت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ جب وہ نوجوانوں کی میٹنگ میں شامل ہونے کے لئے آیا۔ تو ایک نوجوان

نے بجاء سلام کرنے یا اُٹھ کر عزّت کرنے کے اس کو جگہ دینے سے بھی انکار کر دیا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ کہ "تمہارا کوئی بچہ نہیں ہے۔ جو اگر میں بوڑھا ہو جاؤں تو میری عزّت کرے"۔ یہ ایک قسم کا پتری رن سمجھا جاتا تھا۔ بنابریں ہر ایک سپارٹن کے لئے صاحب اولاد ہونا لازمی تھا۔ شادی محض اولاد کی خاطر کی جاتی تھی۔ شادی میں ماتاپتا کی رضامندی لازمی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ لڑکے اور لڑکی کی رضامندی مقدم سمجھی جاتی تھی۔ نابالغ یا نابالغہ کی شادی قانوناً جرم قرار دی گئی تھی ✤

شادی کے بعد سپارٹن میاں بیوی کا باہمی کیا سلوک ہوتا تھا۔ وہ موجودہ زمانہ کے لحاظ سے بہت ہی عجیب معلوم ہوگا۔ نوجوان کو ہرگز اجازت نہیں ہوتی تھی۔ کہ وہ رات کے وقت اپنی بیوی کے پاس سویا رہے۔ بلکہ اُسے مردوں میں ہی سونا پڑتا تھا۔ گربھادان سنسکار ہوتا تھا۔ وہ بھی جب سنتان اُتپتی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ سنسکار کے بعد خاوند کا عورت کے پاس جانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ تو ایک کلیہ قاعدہ تھا۔ کہ رات کو مرد مردوں میں ہی سوتے تھے۔ لائیکرگس نے یہ قانون اس لئے جاری کیا تھا۔ کہ ایسا کرنے سے اول تو میاں بیوی کی محبت میں فرق نہیں آئیگا۔ دوسرے ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر اُن کے جسم مضبوط اور اچھی اولاد پیدا کرنے کے قابل بنے رہینگے۔ لائیکرگس کے نزدیک شادی کا مدعا سوائے عمدہ سنتان پیدا کرنے کے اور کوئی نہیں تھا۔ اور کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ لائیکرگس کے نزدیک بچّے ماتاپتا کی جائداد یا ملکیت نہیں تھے۔ بلکہ ملک کی ملکیت تھے۔ ماتاپتا کا کوئی ادھیکار نہیں تھا۔ کہ وہ کمزور بچّے پیدا کر کے ملک کو نقصان پہنچائیں۔ اس لئے وہ اس بات کو گورنمنٹ کا حق سمجھتا تھا۔ کہ وہ ایسے وسائل اختیار کرے۔ ایسے قوانین بنائے۔ جن پر عمل کرنے سے عمدہ سے عمدہ اولاد پیدا کی جاسکے۔ لائیکرگس نے نہ صرف بیاہ

شادی کے متعلق قوانین جاری کئے بلکہ سنتان اتپتی کے لئے :-

He allowed, that if a man in years should have a young wife, he might introduce to her some handsome and honest youngman, whom he most approved of, and when she had a child of this generous race, bring it up as his own. On the other hand, he allowed that if a man of character, should entertain a passion for a married woman on account of her modesty and the beauty of her children, he might treat with her husband for admission to her company, so that planting in a beauty-bearing soil, he might produce excellent children, the congenial offspring of excellent parents.—" Heny Morley's lifeof Lycurgus p. 170."

"اُس نے اس بات کو قانوناً جائز رکھا تھا۔ کہ اگر کوئی شخص بوڑھا یا اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو۔ اور اُس کی استری نوجوان ہو۔ تو وہ کسی ایسے خوبصورت سداچاری نوجوان کو جس کو کہ وہ دل سے پسند کرتا ہو۔ اپنی استری کے پیش کرے۔ جب استری اس نیک نہاد سے بچہ حاصل کر لے۔ تو وہ اُس کو اپنا بچہ سمجھ کر تعلیم و تربیت دے۔ برعکس اس کے لائیکرگس نے یہ بھی اجازت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی سداچاری نوجوان کسی شادی شدہ استری کی دھرم شیلتا اور اُس کی سنتان کی خوبصورتی کی وجہ سے اُس سے سنتان پیدا کرنے کی خواہش کرتا ہو۔ تو وہ نوجوان اُس استری کے خاوند سے اس بارے میں بات چیت کرے۔ تاکہ وہ اُس خوبصورت سنتان اتپن کرنیوالی بھومی میں تخم بو کر نہایت عمدہ بچے پیدا کر سکے۔ جو کہ عمدہ ماتا پتا کے ملاپ سے توانا و تندرست ہوں۔" ہنری مورلے لائیکرگس صفحہ ۱۷۰
شاید بعض اصحاب لائیکرگس کے اس قانون کو معیوب سمجھیں یا اس کو ایک قسم کی زناکاری خیال کریں۔ مگر نہیں۔ یہ زناکاری نہیں تھی۔ بلکہ زناکاری کی بیخکنی

کرنے کے لئے ایک نہایت ہی عمدہ اور بے خطا اصول و قانون تھا۔ لائیکرگس کے اس قانون سے تین باتوں کا پتہ لگتا ہے:-

اول۔ سنتان اتپتی کے لئے ہی مرد اور عورت کا ملاپ +

دوم۔ اس پوتر ذمہ واری کو پورا کرنے کے لئے مرد اور عورت کا سداچاری ہونا +

سوم۔ سنتان اتپتی کے لئے دونو مرد اور عورت یا میاں بیوی کی رضامندی +

جس ملک میں یہ تین چیزیں ہوں۔ وہاں سے زناکاری کی جڑ اکھڑ جاتی ہے۔ لیکن جہاں یہ نہیں ہے۔ وہاں شادی بھی ایک قسم کی "لیگالارائزڈ پراسٹی ٹیوشن" یا "قانوناً جائز زناکاری" ہے۔ ہمارے موجودہ زمانہ کی شادیاں عموماً اس نام سے ہی پکارتی جاتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم پیچھے دکھا آئے ہیں۔ سپارٹا میں یہ حالت بالکل نہیں تھی۔ بلکہ وہاں سب سے پہلے لڑکے اور لڑکی کا برہمچاری اور برہمچارنی رہنا۔ بعد ازاں گن۔ کرم سوبھاؤ کے مطابق سوئمبر وواہ کا ہونا۔ وواہ ہو چکنے کے بعد بھی مردوں کا سوائے گربھادان سنسکار کرنے کے ہمیشہ مردوں میں ہی سونا اور اپنی استری سے بالکل الگ رہنا مقدم سمجھا جاتا تھا۔ سداچار اُن میں پہلی چیز تھی۔ سداچار کی بنا پر ہی لائیکرگس نے "نیوگ" کو قانوناً جاری کیا تھا۔ اُس کے نزدیک وواہ اور "نیوگ" محض سنتان کی خاطر ہوتا تھا۔ "نیوگ" کے لئے مرد اور عورت دونو کا سداچاری ہونا لازمی تھا۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ شادی شدہ عورت یا شادی شدہ مرد کے ساتھ "نیوگ" کرنے کے لئے قانوناً لازمی تھا۔ کہ وہ خاوند اور بیوی کی رضامندی سے ہو۔ اگر خاوند بیوی کو دوسرے مرد کے ساتھ یا بیوی خاوند کو دوسری عورت کے ساتھ "نیوگ" کرنے کی اجازت دیدیتا یا دیدیتی تھی۔ تب ہی یہ بات کی جاتی تھی۔ ورنہ ہرگز نہیں۔ اور قانون بھی اسی صورت میں اُس کے حق میں ہوتا تھا۔ ورنہ نہیں۔ لائیکرگس کا یہ قانون منو سمرتی پر مبنی تھا۔ منو سمرتی کے نویں ادھیائے کے ۵۷ سے لیکر ۷۰ تک کے

شلوکوں میں نیوگ کا مفصل ذکر ہے۔ جا بجا یہی ہدایت ہے۔ کہ نیوگ سنتان نہ ہونے کی صورت میں کیول سنتان کی خاطر ہی ہونا چاہئے۔ منو نے نیوگ کے لئے کیا کیا شرائط لازمی رکھی ہیں۔ اُن کو رشی دیانند نے مختصر الفاظ میں یوں بیان کر دیا ہے:۔

"جیسے علانیہ بیاہ ویسے علانیہ نیوگ۔ جس طرح بیاہ میں نیک اشخاص کی صلاح اور دُلہن دلہا کی رضامندی ہوتی ہے۔ ویسے نیوگ میں بھی ہونی چاہئے۔ یعنی جب عورت مرد کا نیوگ ہونا ہو۔ تب اپنے خاندان میں مرد عورتوں کے سامنے ظاہر کریں۔ کہ ہم دونوں اولاد پیدا کرنے کی غرض سے نیوگ کرتے ہیں۔ جب نیوگ کا مدعا پورا ہو جائیگا۔ تب ہمارا قطع تعلق ہو جائیگا۔ اگر اس کے خلاف کریں تو گنہگار اور ذات یا راجہ کی سزا کے مستوجب ہوں ستیارتھ پرکاش صفحہ ۱۵"

قوانین لائیکرگس اور قوانین منو اس بارے میں دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ کہ زناکاری کی تعریف۔ اُس کے مکروہ نتائج یا اُس کے دوسرے خوفناک پہلوؤں پر بحث کریں۔ دنیا سے اگر زناکاری کا دور ہونا ممکن ہے۔ تو وہ محض اسی طریقہ اور اُن ہی قوانین کے جاری ہونے سے ممکن ہے۔ جن کا کہ منو یا لائیکرگس نے ذکر کیا ہے۔ اس میں تو ذرا بھی شک نہیں۔ کہ لائیکرگس ہندوستان میں آیا۔ اور اُس نے ہندوستان کے آئین و قوانین کا بغور مطالعہ کیا۔ سادھوؤں سنیاسیوں سے بات چیت کی جیسا کہ ہم پیچھے لکھ آئے ہیں۔ اور قوانین منو میں سے چند ایک قوانین اُس نے سپارٹا میں جا کر جاری کئے۔ جن میں سے ایک "نیوگ" کا قانون تھا۔ یہ اسی قانون کی بدولت تھا کہ اہل سپارٹا میں زناکاری کی بیخکنی ہو گئی اسی قانون کی بدولت سپارٹا نواسی جیرادس اجنبی کو خم ٹھوک کر یہ جواب دے سکتا تھا:۔

"دوست! اگر دنیا میں اتنا لمبا بیل ملنا ناممکن ہے۔ تو سپارٹا میں زناکاری کا ہونا بھی ناممکن ہے۔"

سداچار

"ہم نے لارڈ آوبری کے مضمون کا ترجمہ کرتے ہوئے "کیرکٹر" کے لئے سداچار۔ اور ڈیوٹی کے لئے "دھرم" کے لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ باقی مضمون میں مکھی پر مکھی مارنے کی بجائے ہم نے مصنف کی سپرٹ کو مدنظر رکھا ہے۔ ایڈیٹر"

دنیا میں معمولی طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ کہ انسان سداچاری اور پرُ شار تھی ہو۔ گو میں سداچار کو محض اسی حد تک ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔ مگر پھر بھی سداچار کی بڑی بھاری ضرورت ہے۔ اتنا جان لینا تو بڑا آسان ہے۔ کہ اچھے عمل کرنے چاہئیں۔ مگر ضروری یہ ہے۔ کہ ہم جاننے کے علاوہ کریں بھی۔ کیونکہ اچھے اعمال کرنے پر ہی ہماری زندگی کی بہبودی ترقی اور خوشی کا انحصار ہے۔ اچھے اعمال کا نام ہی اچھی زندگی ہے۔ زندگی کا اندازہ دنوں سے نہیں لگایا جاتا۔ بلکہ اس بات سے لگایا جاتا ہے۔ کہ نیک اعمال کس قدر کئے ہیں۔ کیمبل صاحب فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ فیصلہ کر لو کہ تمہارا وویک کس بات میں تمہارا ساتھ دیتا ہے۔ اس کے بعد انتظاری اور لیت ولعل مت کرو۔ تمہارے ہاتھ میں ہر ایک خوشی اور برکت کی چابی ہے۔ پاپی سے پاپی بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ دھرم کا پرتیاگ کر کے یا اُس کو پس پشت ڈال کر تم کو کبھی بھی خوشی نہیں مل سکتی۔ ورڈ سورتھ کا قول ہر ایک نیک اور عقلمند آدمی کا خاصہ ہونا چاہئیے یعنی اُس کو بزدلانہ طور پر خوف وخطر کا ذکر نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ جہاں دھرم اجازت دیتا ہو۔

اُس کو فوراً وہاں کود پڑنا چاہیئے۔ دھرم کے لئے ہزاروں خطرات کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اور پرماتما پر بھروسہ رکھتے ہوئے اُن پر فتح حاصل کرنی چاہیئے۔ بلیکی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ زندگی میں کامیابی کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے؟ وہ بتاتے ہیں۔ کہ روپیہ کی ضرورت نہیں طاقت کی ضرورت نہیں۔ چالاکی کی ضرورت نہیں۔ شہرت کی ضرورت نہیں آزادی کی ضرورت نہیں۔ ہاں صحت کی بھی اتنی ضرورت نہیں۔ صرف سداچار کی ضرورت ہے۔ سداچار ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو ہم کو بچا سکتا ہے۔ اگر ہم سداچاری نہیں ہیں۔ تو کوئی چیز ہم کو نہیں بچا سکتی۔ تمہارا کیرکٹر کس قسم کا ہو۔ یہ تمہارے اپنے اختیار کی بات ہے۔ ہم سب کے سب شاعر راگی۔ صناع یا سائنس دان نہیں ہو سکتے۔ بقول مارکس آریلیس دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں۔ جن کے بارے میں تم کو کوئی علم نہیں ہے پس اُن ہی طاقتوں کا استعمال کرو جو کہ تمہارے قبضہ میں ہیں۔ صداقت سنجیدگی۔ برداشت۔ آرام سے نفرت۔ فیاضی۔ کشادہ دلی۔ فضولیات سے پرہیز۔ نکمی باتوں سے آزادی اور بلند پروازی سے کام لو۔ کیا تم نہیں دیکھتے۔ کہ پرماتما نے تم کو کس قدر طاقتیں دے رکھی ہیں۔ مگر تم اُن کا استعمال نہیں کرتے۔ حالانکہ ناقابلیت یا نالائقی کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ کیا کوئی تم کو اس بات پر مجبور کر رہا ہے۔ کہ تم قدرت پر الزام لگاؤ۔ اور یہ کہو۔ کہ اس نے تم کو کمزور بنایا ہے۔ ایسا کرنا کمینہ پن ہے۔ اپنے کمزور جسم میں نقص دیکھنا یا انسانوں کو خوش کرنے کے لئے خوشامد کرنا۔ یا نمائش سے کام لینا اور اپنے آپ کو ہر وقت بے چین رکھنا انسانیت سے بعید ہے۔ تم ان باتوں سے بھی چھٹکارا پا سکتے ہو۔ اگر تم کسی کام کو دیری سے یا آہستہ آہستہ کرنے کے عادی ہو۔ تو بھی مضائقہ نہیں کئے جاؤ۔ مگر اپنی کاہلی میں خوش نہ رہو۔ نہ ہی اس کو کبھی نظر انداز کرو۔ کبھی ایسی بات نہ کرو۔ کہ جس کے لئے تم کو شرمندہ

ہونا پڑے۔ کم از کم ایک رائے ایسی ضرور ہے۔ جو تمہارے لئے نہایت ہی فائدہ مند اور تسلی بخش ہے۔ اور وہ رائے تمہارا اپنا ضمیر ہے۔ سنیکا صاحب فرماتے ہیں۔ جس کا ضمیر آرام میں ہے۔ وہ سدا چین اڑاتا ہے۔ ہم فرینکلن صاحب کے ان کی ٹھیک نصیحتوں کے لئے مشکور ہیں۔ مگر جو ترکیب وہ آتما کو سنتشٹ رکھنے کے لئے بتاتے ہیں۔ وہ بڑی کٹھن ہے۔ میں اس کی سفارش نہیں کرسکتا۔ نیکیوں کا مختصر ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ میں ان تمام خوبیوں کو حاصل کردں۔ مگر ایسا کرنے کے لئے مجھے ایک ہی دفعہ سب کو مد نظر نہیں رکھنا چاہئیے۔ بلکہ ایک ایک کرکے اُن کو حاصل کرنا چاہئیے۔ جب ایک کو حاصل کرلوں۔ پھر دوسری کو کرنا چاہئیے یہاں تک کہ میں تیرہ خوبیوں کو حاصل کرلوں گا۔ یعنی اعتدال۔ خاموشی۔ ترتیب۔ ارادہ۔ کفایت شعاری۔ محنت۔ صداقت۔ انصاف۔ میانہ روی۔ صفائی۔ شانتی۔ پاک دامنی اور انکساری۔ یہ بڑا کٹھن معلوم ہوتا ہے۔ کہ آیا انہوں نے اس مسئلہ پر عمل بھی کیا تھا یا نہیں۔ کیونکہ یہ ضروری ہے۔ کہ اگر تم ایک شیطان کو اندر آنے دوگے۔ تو اُس کا تمام کنبہ ساتھ آئیگا۔ ولسن صاحب نے کہا ہے۔ کہ ہم یہ سنتے ہی حیران ہوجاتے ہیں۔ جبکہ کوئی شخص کسی بھیک منگے کو پیسہ دیکر کہتا ہے۔ کہ جاؤ۔ اس کی شراب لے کر پی لینا۔ یا جوئے میں ہار دینا۔ یا کوئی نکما کھلونا خرید لینا۔ لیکن ہم دوسروں کو کیوں کہتے ہیں۔ ہم خود ہی ایسا کیوں نہیں کر لیتے۔ محض اس لئے کہ دوسرے لوگ ہم پر ہنسی کرینگے +

تمہاری نظر اوپر رہنی چاہئیے۔ نیچے کو نہیں۔ لارڈ بیکنسفیلڈ صاحب کا قول ہے۔ کہ جو شخص بلند نظر نہیں ہے۔ وہ پست ہمت ہے۔ جو بلند پروازی کی خواہش نہیں رکھتا۔ وہ نیچے ہی رینگتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے نزدیک ادنے درجہ کے آدرش کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ نہ ہی

ہمارے بڑے بڑے آدمیوں مثلاً شیکسپیر - ملٹن - ڈارون وغیرہ نے کبھی
سرکاری عہدوں یا خطابات کی خواہش کی - اس قسم کے ادنےٰ درجہ کے آدرش
رکھنے والے آدمیوں کی تسلی کبھی بھی نہیں ہوا کرتی - کیونکہ جیسے ایک پہاڑ کی
چڑھائی کے بعد دوسرا پہاڑ نظر آنے لگتا ہے - اسی طرح ایک چھوٹی سی خواہش
کے پورا ہونے پر دوسری خواہشات سر نکالتی ہیں - سکندر اعظم اور نپولین
اسی قسم کے انسانوں میں سے تھے - اُن کے آدرش غلط تھے - اسی لئے اُن
کو نہ تو کبھی چین ہی ملا - نہ ہی وہ کبھی کسی کے مشکور ہوئے - بیکن صاحب فرماتے
ہیں - کہ جو شخص ہمیشہ آگے ہی بڑھنے کا عادی ہے - جس کے راستے میں
کبھی کوئی رکاوٹ آئی ہی نہیں - وہ رکاوٹ کے آنے پر گر جاتا ہے - اور جو
کچھ پہلے تھا - اب وہ وہ نہیں رہتا - ہم شاعر کے اس مقولہ کے ساتھ
کہ پُرعظمت زندگی کا ایک گھنٹہ گمنام عمر سے بڑھ کر ہے - کلیتہً اتفاق نہیں
کر سکتے - نمود کی خواہش چھلاوے کی مانند ہے - جو محض ایک چمکدار دھوکہ
ہے - نمود کے بارے میں وائلس جیسے شاعر نے کیا اچھا کہا ہے :-

"یہ ایک عظیم الشان دھوکہ بازی ہے - یہ لائق بچوں کے کمروں
کو تلاش کرتی ہے - چپکے سے دروازہ کھول کر اندر آجاتی ہے -
اُن کے تنگ خیالات پھیلنے لگتے ہیں - یہاں تک کہ وہ ایک شاہی
محل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں - جس کی چھت آسمان سے بھی
اُونچی ہوتی ہے - اور اُس پر خیالی نقش ونگار بنانے لگتے ہیں - اور
سمجھتے ہیں - کہ بس اب ہمارا نام ہمیشہ کے لئے اس پر کندہ رہیگا
مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے - زیادہ سے زیادہ یہ کہ ایک دفعہ نام ہو گیا
اور بس - اُن کی تعریف ہوتی ہے - مگر اس وقت جبکہ اُن کے کان
سننے سے رہ جاتے ہیں - ان کو روپیہ مل جاتا ہے - مگر اُس وقت
جبکہ اُس کے استعمال کی تمام طاقت جاتی رہتی ہے - اُن کو کامیابی کی ملا

مل جاتی ہے۔ مگر اُس وقت جبکہ اُن کے بال سفید ہو چکتے ہیں۔ اُن کو شہرت مل جاتی ہے۔ مگر اُس وقت جبکہ دل مردہ ہو چکتا ہے۔ غرضیکہ اُن کو تمام چیزیں مل جاتی ہیں۔ مگر وہ ایشور پریم سے محروم رہتے ہیں۔ حالانکہ ایشور پریم ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی ہم کو ضرورت ہے۔ ان چیزوں کے ملنے کے ساتھ ساتھ موت بھی ہمارے پیچھے چلی آتی ہے۔ ہمیں جب ہی پتہ لگتا ہے۔ جبکہ وہ ہم کو تمام چیزوں سے محروم کر کے جن کو کہ ہم نے بڑی جد وجہد سے حاصل کیا تھا۔ ہمارا خاتمہ کر دیتی ہے۔"

افسوس! کسی قسم کا رتبہ بھی انسان کے کیا کام آسکتا ہے۔ کیا یہ ایک عبرتناک واقعہ نہیں ہے۔ کہ میری ڈی میڈیسس جو کہ فرانس کی ملکہ تھی۔ فرانس کی ریجنٹ تھی۔ فرانس کے بادشاہ کی۔ سپین کی ملکہ کی۔ انگلینڈ کی ملکہ اور ڈچس اف سیوائے کی ماتا تھی۔ اُس کو آخرکار اس کے تمام بچوں نے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ کوئی اُس کو اپنے ملک میں گھسنے تک کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ آخرکار وہ کولون میں مصیبت زدہ ہو کر دس سال کے مصائب کے بعد مارے بھوک کے مر گئی۔ اوہ! دنیا کی بیوفائی کا کیسا دردناک نظارہ ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ دنیا کے بادشاہوں کے تاج کانٹوں کے تاج ہیں۔ جس قدر کہ تاج پوش زیادہ ہوش میں آتا جاتا ہے۔ اسی قدر ذمہ واریوں کا بوجھ اُس کو کچلتا جاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ اُن کو تکلیف نہ ہو۔ جبکہ اُن کی ذراسی غلطی سے ہزاروں جانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے گو ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی بڑی ہی مزیدار بنتی جاتی ہے۔ مگر اس کے بغیر زندگی کا کچھ لطف بھی نہیں آتا۔ ٹریچ نے سچ کہا ہے۔ کہ انسان کی زندگی میں ایسے لمحے بہت سے آتے رہتے ہیں۔ جبکہ اُس کو اوپر اٹھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس پہلو میں اُس کو قدرت کی ہر ایک طاقت سے مدد لینی چاہئے۔ انسان آگے بڑھنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ کھڑا رہنے کے لئے نہیں۔ ہم میں سے بہت

سے انسان ایک جگہ پر چپ چاپ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہئے۔ اگر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تو ہم مر جائینگے۔ اور مارے جائینگے۔ مگر آگے بڑھنے میں وسائل وانجام کے بارے میں بڑی دیانت داری اور ایمانداری سے کام لینا چاہیئے۔ جو شخص بے ایمانی سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ یا بڑھ جاتا ہے۔ وہ جلدی ہی گر جایا کرتا ہے۔ سوال یہ ہے۔ کہ ہم اپنی فطرت کے ان دو تقاضاؤں کو کیونکر پورا کریں۔ اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ کہ ہمیں اپنے من پر حکومت کرنا سیکھنا چاہیئے من کی بادشاہت بڑی وسیع بادشاہت ہے۔ اور وہ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ہے۔ آگے بڑھنے کے معنی یہی ہیں۔ کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ سچا گیان حاصل ہو۔ اور ہم سچے کرم کانڈی بنیں۔ گیان اور کرم کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آنی چاہیئے۔ جس قدر ہم آگے بڑھتے ہیں۔ اسی قدر یہ راستہ محفوظ اور خطرات سے خالی ہوتا جاتا ہے۔ پس سب سے پہلی اور سب سے اعلےٰ خواہش جو انسان کے دل میں ہونی چاہیئے۔ وہ یہ کہ اُس کو دھرم پر آروڑھ رہنا چاہیئے۔ مسٹر گریک کے یہ بجلی بھرے سیدھے سادھے شبد ایک عظیم الشان ستیہ کا پرکاش کرتے ہیں:۔

"وہ جو منش ستیہ پرائن ہو کر دھرم کا پالن کرتا ہے۔ اُس کو تاج کی ضرورت نہیں۔ سنسار میں من موہنی مایا اُس کے من کو نہیں ہر سکتی۔ متر اُس کی تعریف کریں۔ یا شترو اس کی نندا کریں۔ موت بھی ایسے انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ خواہ وہ بے نام و نشان بھی کیوں نہ ہو"

کہتے ہیں۔ کہ ڈیوک آف ویلنگٹن کے تمام مراسلات میں "وِدگاوری" یا عظمت کا شبد ایک دفعہ بھی نہیں آیا۔ بلکہ اُس نے سب جگہ ڈیوٹی یا دھرم کا ہی استعمال کیا ہے۔ ڈیوٹی اُس کا تکیہ کلام تھا۔ تم آگے بڑھو۔

مگر دھرم کو لیکر دھرماتما انسانوں کی طرح۔ بائرن نے کہا ہے۔ کہ ایک دھرماتما انسان کو فتح کرنے کے لئے دس ہزار فاتحوں کی ضرورت ہے۔ تواریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ آج سے سو سال کے بعد کوئی نہیں جانیگا۔ کہ تم دولتمند تھے یا کنگال۔ زمیندار تھے یا باجگذار۔ لیکن یہ سب کو یاد رہیگا۔ کہ آیا تم نے اپنی زندگی میں اچھے کام کئے تھے یا بُرے۔ رسکن صاحب فرماتے ہیں۔ "خیال۔ علم یا اعتقاد کا اتنا نتیجہ نہیں نکلتا۔ نتیجہ کی بات ہمارے کرم ہیں۔ تمیز کہاں ملتی ہے۔ عقل کی جگہ کہاں ہے۔ انسان اُس کی قیمت نہیں لگا سکتا۔ نہ ہی اس کا دنیا میں پتہ لگ سکتا ہے۔ گہرائیوں سے آواز آتی ہے۔ کہ یہ چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔ سمندر سے آواز آتی ہے۔ کہ ہمارے پاس نہیں۔ سونے کے بدلے اُس کو خرید نہیں سکتے۔ چاندی کے تول اُس کو لیا نہیں جا سکتا۔ مونگے موتی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ عقل و تمیز کی قیمت لعل سے بھی بڑھکر ہے۔ پرماتما سے ڈرنا ہی عقلمندی ہے۔ پاپ سے بچنا ہی تمیز ہے دیانت دار اور راست گفتار بنو۔ جین پال رچر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ دنیا میں شیطان نے جو سب سے پہلے پاپ کیا تھا۔ وہ جھوٹ تھا۔ دیانت داری بہت اچھی چیز ہے۔ یہی راہ راست ہے۔ خداوند کو پاسنگ کا ترازو پسند نہیں آتا۔ وہ سیدھے ترازو سے خوش ہوتا ہے۔ چوسر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ ستیہ سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہے۔ ستیہ کی ہمیشہ پالنا کرنی چاہئے۔ کلیرنڈن صاحب فاکلینڈ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ وہ ستیہ کے اتنے پریمی تھے۔ کہ وہ کہا کرتے تھے۔ کہ میں شاید چوری کرنے کی اپنے آپ کو اجازت دیدوں۔ مگر جھوٹ کبھی نہیں بول سکتا۔ پلوطارق کا قول ہے۔ کہ جو لوگ ستیہ سے گریز کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں۔ کہ وہ پہلے تو خدا سے نفرت کرتے ہیں اور پھر انسانوں سے ڈرنے لگ جاتے ہیں۔ اگر تم غلطی پر ہو۔ تو تم کو شرمندہ ہونا چاہئے۔ لیکن اپنی غلطی کو تسلیم کرنے سے تم کو ہرگز جھجکنا نہیں چاہئے

انسان میں بہت سی صفات ایسی ہیں۔ جوکہ اُس کو زندگی کے کام کے عین مناسب بنا دیتی ہیں۔ مگر ایک صفت ایسی ہے۔ جوکہ بہت ہی ضروری ہے۔ جس کے بغیر انسان انسان ہی نہیں رہتا۔ جس کے بغیر کوئی آدمی بھی بڑا بن نہیں سکتا۔ جس کے بغیر کوئی بھی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صفت سچائی ہے۔ سچائی اپنے اصلی معنوں میں ایک بیش بہا چیز ہے۔ تمام بڑے بڑے اور نیک انسانوں کی طرف دیکھو۔ ہم اُن کو بڑا آدمی کیوں کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں سچ بولنے کی طاقت تھی۔ وہ اپنے لئے سچے تھے۔ اور وہ وہی تھے۔ جو کچھ کہ وہ ہوتے تھے۔ شیکسپیر نے کہا ہے۔ کہ سب سے بڑھکر تم اپنے لئے سچے رہو۔ ایسے ہی سچے رہو۔ جیسے کہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا ہونا سچ ہے۔ پھر تم کسی کے ساتھ بھی جھوٹا معاملہ نہیں کر سکوگے +

ورڈسورتھ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ دو چیزیں گو وہ متضاد نظر آتی ہیں۔ مگر ہمیشہ ایک ساتھ ہونی ضروری ہیں۔ ایک تو پرتنترتا اور سوتنترتا دوسرے وشواس و آتم وشواس۔ اطاعت کرنا سیکھو۔ حکومت کرنا بعد میں خود ہی سیکھ جاؤگے۔ بُرا سپاہی کبھی بھی اچھا جرنیل نہیں بنا کرتا۔ اسی لئے دل اور جسم کی ڈرل ضروری ہے۔ کامیابی میں مغرور مت بنو۔ غرور تباہی لاتا ہے۔ اور مغرور گر جاتا ہے۔ ہم بعض اوقات جوش کا نام کام اور ریکاری کا نام صبر رکھ دیتے ہیں۔ مگر یہ غلطی ہے۔ صبر کے لئے طاقت کی ضرورت ہے مگر جوش کمزوری اور چنچلتا کی علامت ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جوش کم ہوتا جاتا ہے۔ مگر عادات مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اگر پرماتما نے تم کو کوئی ذمہ واری کا عہدہ دیا ہے۔ تو بلا رورعایت انصاف اور حلم سے کام لو۔ سعدی صاحب نے ایک جگہ ایک مشرقی بادشاہ کی کہانی لکھی ہے۔ جس نے ایک بیگناہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ مظلوم نے کہا۔ اے بادشاہ! اپنے اوپر رحم کر۔ مجھے

تو ایک لمحہ بھر کی تکلیف ہوگی۔ مگر میرے خون کا داغ تمہارے دامن پر ہمیشہ تک موجود رہیگا۔ کون نہیں جانتا۔ کہ اختیارات کے بڑھنے پر ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن تم یہ کبھی بھی مت سوچو۔ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ بلکہ یہ سوچو۔ کہ تم کو کیا کرنا چاہیئے۔ خوشی کی طرف جانے کا سیدھا راستہ یہی ہے۔ اگر دو باتوں میں کبھی شک پیدا ہو جائے۔ تو اُن میں سے کم کو اختیار کرو۔ بعض لائق آدمی دوسروں کی خاطر اپنے ہمسایوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ مگر خیرات کی طرح ہمدردی بھی گھر سے شروع ہونی چاہیئے۔ اس دنیا کی ہر ایک چیز راستی کا سبق دے رہی ہے۔ اور وہ سب کچھ ہماری ہی بھلائی کے لئے ہے۔ ہم بڑی آسانی سے اُس کا یقین کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں۔ کہ پاپ سے دکھ ملتا ہے۔ دکھ کون دیتا ہے۔ ہم ہی اپنے آپ کو دُکھ دیتے ہیں۔ دنیا کی بناوٹ ہی ایسی ہے۔ کہ نیکی سے سکھ اور پاپ سے دُکھ ملتا ہے۔ پاپ کرنا اور اس کی سزا نہ بھوگنا قانون قدرت کو توڑنا ہے۔ گناہوں کی معافی کا مطلب یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم کو سزا نہیں ملنی چاہیئے۔ گناہوں کی سزا نہ ملنا صرف ایک ناممکن بات ہی نہیں ہے۔ بلکہ انسان پر ایک قسم کا ظلم ہے۔ کیونکہ پاپ میں قدم آگے ہی آگے رکھتے جانے سے بڑھکر اور کوئی بدقسمتی نہیں ہو سکتی۔ اگر تم پاپ کرتے ہو۔ تو یہ تمہیں برابر بے چین کرتا رہیگا۔ جن لوگوں کے ساتھ تم نے بُرائی کی ہے۔ وہ تمہیں معاف کر سکتے ہیں۔ مگر ان کا معاف کرنا تمہارے کوئلوں سے بھرے ہوئے دماغ کو اور بھی بدتر بنا دیگا۔ کیونکہ اُن کے درگذر کرنے سے تمہاری بُرائی اور بھی سیاہ شکل میں نمودار ہو گی ÷

سادا چار ہی زندگی ہے۔ زندگی کی خوشی اور اقبال کا انحصار اسی پر ہے۔ بیرونی حالات نسبتاً کم ضروری ہوتے ہیں۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ کہ ہمارے ارد گرد کے حالات کیسے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ ہم کیا ہیں۔ پس

تم روز اپنی جانچ پڑتال کرتے رہو۔ یہاں تک کہ تم اُس کے عادی بن جاؤ گے جب عادت پڑ گئی۔ تو سمجھو۔ کہ کام ٹھیک ہو گیا۔ کیونکہ عادت فطرت ثانی ہے۔ بورڈمین صاحب نے فرمایا ہے بدی کم عمل کا بیج بو دو۔ اور عادت کی کھیتی کاٹ لو۔ عادت کا بیج بونے سے سداچار کی کشت لہرانے لگتی ہے۔ سداچار کا بیج بو دو۔ تم اپنی قسمت کے مالک بن جاؤ گے۔" ہم ہر روز کچھ نہ کچھ بنتے رہتے ہیں۔ خواہ اچھے بنیں۔ خواہ بُرے۔ ضروری ہے۔ کہ ہم روز رات کے وقت اپنے آپ سے سوال کریں۔ کہ آج ہم کیا بنے ہیں۔ ایمرسن صاحب کے قول کے مطابق انسان دو اقسام میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل وہ جو دوسروں کے ساتھ نیکی کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بدی کرتے ہیں۔ اگر تم دوسری کلاس میں شامل ہو۔ تو تم ایک بدقسمت انسان ہو۔ تم اپنے دوستوں کو دشمن اپنی یادداشت کو تکلیف دہ۔ زندگی کو رنج و الم دنیا کو اپنے لئے قید خانہ اور موت کو اپنے لئے خوفناک بنا لو گے[1]۔ برعکس اس کے اگر تم نے کسی انسان کے دل میں ایک بھی اعلےٰ بھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ یا کسی انسان کی زندگی میں خوشی کی ایک گھڑی بھی زیادہ کر دی ہے۔ تو تم نے ایک فرشتہ کا کام کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو۔ اگر ہر ایک شخص روزمرہ ایک گھنٹہ تک ایکاگرچیت

[1] ہم لارڈ موصوف کے اس خیال کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ جو شخص دوسروں کے ساتھ بدی کرتا ہے۔ وہی اپنے دوستوں کو دشمن بناتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ شخص بھی اپنے لئے دشمن پیدا کر لیتا ہے۔ جو دوسروں کے ساتھ ہمیشہ نیکی کرتا ہے۔ کانٹوں پر کوئی شخص حملہ نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ پاؤں کو چھلنی کر دیا کرتے ہیں۔ مگر پھول کو توڑنے کے لئے ہر ایک شخص ہاتھ آگے بڑھاتا ہے حالانکہ پھول نے کسی کے ساتھ کبھی بھی ایسی بُرائی نہیں کی ہوتی۔ جس کی سزا میں اُس کی گردن ماری جا سکے۔ ایسے لوگوں کی رہنمائی کے لئے "نیکی کر اور دریا میں ڈال" ہی ایک سچا رہبر ہو سکتا ہے۔ ایڈیٹر

ہو کر دھیان کیا کرے۔ اگر ایک گھنٹہ نہیں۔ تو کم از کم نصف گھنٹہ ہی سہی۔ یہ کہنا تو ناممکن ہے۔ کہ اُن کو کوئی وقت نہیں ملتا۔ وقت ہر وقت موجود ہے۔ سر رابرٹ پیل صاحب کا یہ قاعدہ تھا۔ کہ جب وہ ہاؤس آف کامنس سے واپس آتے تھے۔ تو رات کے وقت ہر روز بائیبل کی ایک فصل پڑھ لیا کرتے تھے۔ گو اُن دنوں میں ہاؤس آف کامنس کے اجلاس اتنے لمبے نہیں ہوتے تھے۔ جتنے لمبے کہ آجکل ہوتے ہیں۔ اگر تم ہمیشہ نیکی کا خیال کرتے رہو گے۔ تو تم بُرائی نہیں کر سکو گے۔ سر والٹر ریلے کا قول ہے۔ کہ جو شخص موت اور حشر نرک اور سورگ کا زیادہ خیال کرتا رہتا ہے۔ اس کو چاہئیے۔ کہ وہ نیک اعمال بھی کرے۔ نیک اعمال کا صلہ بڑا بھاری ہے۔ تمثیلات میں کہا گیا ہے۔ "میرے بیٹے! میرے قانون کو مت بھولو۔ تیرے دل میں میرے احکام کی عزت ہونی چاہئیے۔ اس وقت تک جب تک کہ تو زندہ ہے۔ تجھے شانتی نصیب ہوگی"۔

تم التوا سے کام مت لو۔ اوائل عمری کو ایک قسم کا بہانہ مت بناؤ۔ مارگریٹ آف ویلائس نے کہا تھا۔ کہ "جس دن ہماری ہڈیوں پر چمڑا نہیں رہیگا اس دن ہم سب نیک بن جائینگے"۔ تم نوجوانی کے دنوں میں پرماتما کی پرستش کرو۔ اگر ہم ایسی موت مرنا چاہتے ہیں۔ جیسی کہ ہم چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اعمال بھی ویسے ہی کرنے چاہئیں۔ نیک آدمی کے لئے موت کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ بشپ تھرلوال نے اپنی بیماری کے دنوں میں اس بات کا سات زبانوں میں ترجمہ کروایا تھا:۔

"نیند موت کی بہن ہے۔ تم کو چاہئیے۔ کہ اپنے آپ کو کسی ایسے وجود کے سپرد کر دو۔ جو تم کو جگا سکے۔ دونوں سے یعنی نیند کی موت اور موت کی نیند سے"۔

سسرو صاحب فرماتے ہیں۔ کہ جب سقراط کو عدالت میں لے

گئے۔ تو اُس نے یہ نہیں کہا۔ کہ میں مرنے لگا ہوں۔ بلکہ یہ کہا۔ کہ میں سورگ میں جانے لگا ہوں۔ سنیکا صاحب فرماتے ہیں۔ اگر تم اپنے فرض کو بہادری اور عالی حوصلگی سے کئے جاؤ۔ تو جانتے ہو۔ تم کو کیا ملیگا۔ تم فرض کو پورا کر لوگے۔ فرض کی ادائیگی ہی بڑا بھاری انعام ہے۔ تمہیں نیک کام سزا و جزا کی خاطر نہیں کرنے چاہئیں۔ بلکہ محض اس لئے کہ وہ نیک ہیں۔ کیونکہ نیک کام بذات خود دل کو خوشی سے بھر دینے والی سند ہے۔ نیکی بذات خود صلہ ہے۔ مگر بعض لوگ ایسے سادہ لوح ہوتے ہیں۔ کہ وہ نیکی یا بدی کی جزا و سزا کے لئے کوئی آسمانی چیزیں فرض کر لیتے ہیں۔ سپینوزا صاحب نہایت ہی طنز آمیز مگر سچائی سے پُر الفاظ میں ایسے لوگوں کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں:-

"میں جانتا ہوں۔ کہ اس قسم کا آدمی کس کیچڑ میں پھنس رہا ہے۔ اگر اُس کو دوزخ کا ڈر نہ ہو۔ تو وہ من مانی بدمعاشی کرنے لگ جائے۔ وہ بُرائی سے پرہیز کرتا ہے۔ اور خداوند کے احکام کی پیروی کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ایسے کرنے میں خوش ہے۔ نہیں بلکہ وہ غلام کی طرح اپنی مرضی کے قطعی برخلاف ایسا کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اور اس غلامی کے لئے وہ خداوند سے یہ توقع رکھتا ہے۔ کہ وہ اُس کو اپنی محبت سے بڑھکر کوئی ایسی چیز انعام میں دیں۔ جو اُس کے مذاق کے عین مطابق ہو۔ اور جس سے اُس کو ایسی ہی محبت ہو۔ جیسی کہ اس کو نیکی سے نفرت تھی۔ اور اسی طرح نیک آدمی کا حال ہے۔ وہ خداوند کے حضور میں آکر یہی امید کرتا ہے۔ کہ اُس کی نیک چلنی اور ایمانداری کا اُس کو کوئی گرانمایہ صلہ مل جاوے۔ مگر جو شخص عقلمند ہے۔ اُس کے نزدیک خداوند کا آشیرباد نیکی کا بدلہ نہیں ہے۔ بلکہ نیکی بذات خود اُس کے لئے خداوند کا آشیرباد ہے۔

اگرچہ نیکی کا راستہ بڑا ڈھلوان ہے۔ مگر تمام چیزیں آسانی سے
حاصل کئے جانے سے دور ہوتی ہیں" +

ہم جانتے ہیں۔ کہ ہم مکمل انسان نہیں بن سکتے۔ مگر پھر بھی ہم کو کیا بہ لحاظ سداچار اور کیا بہ لحاظ دیگر باتوں کے مکمل بننے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں ہمارے پاس وویک ہے۔ اگر ہم اس کی پیروی کریں۔ تو ہم بہت کچھ غلطی سے بچ سکتے ہیں۔ ہر ایک شخص اگر وہ چاہے۔ تو شریفانہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ پس تم اپنے سامنے اعلےٰ سے اعلےٰ معراج رکھو۔ اسی طریقہ سے تم اپنے آپ کو اعلےٰ بنا سکتے ہو۔ اسی طرح لوگ تمہارے حق میں وہ بات کہ سکتے ہیں۔ جو کہ شیکسپیر مارک انٹونی سے بروٹس کی بابت کہلوا رہا ہے:-

"اس کی زندگی ایسی شریفانہ اور اُس کی فطرت میں نیک اوصاف
ایسے مرکوز تھے۔ کہ نیچر تمام دنیا کو مخاطب کر کے کہ سکتی تھی۔ کہ
یہ ایک انسان تھا"

اگر تم عورت ہو۔ تو بقول ورڈسورتھ تم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ کہ تم ایک مکمل دیوی بن سکو۔ تاکہ تم مردوں کو آگاہ کر سکو۔ آرام دے سکو۔ اور حکومت کر سکو۔ مگر تمہارے اندر ایسی شانتی کی سپرٹ ہونی چاہیئے۔ جو کہ دیویوں میں ہوا کرتی ہے +

سیر مذاہب

باب اوّل

پانچویں فصل

روح القدس کی اصلیت

ہم پیچھے دکھا چکے ہیں۔ کہ روح القدس کا پریوار دنیا میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ یورپ کے تقریباً تمام ممالک میں روح القدس کے بچوں کے بقول پادری جسٹن صاحب بنڈل کے بنڈل موجود تھے۔ ایشیا تو روح القدس کے لئے ایک زرخیز زمین ثابت ہوئی تھی۔ مگر افریقہ کے صحرائی صوبے اور شمالی اور جنوبی امریکہ کے پرخار جنگلوں میں بھی روح القدس نے قدم جا دھرا تھا۔ غرضیکہ کسی زمانہ میں روئے زمین پر ایک خاص ہوا چلی ہوئی تھی۔ جس سے کافروں اور موحدوں۔ ملحدوں اور خدا پرستوں کا بچنا مشکل تھا۔ جو اُس کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہی سرنگوں ہو گیا۔ جس نے اس ہوا سے بچنا چاہا۔ وہی مارا گیا۔ غرضیکہ نہ جاء ماندن و نہ راہ رفتن کا سا معاملہ ہو رہا تھا۔ اس تمام گڑبڑ کا نقشہ ہم پیچھے دے چکے ہیں۔ لیکن آج ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ آیا اس تمام گڑبڑ کی تہ میں کوئی اصلیت بھی ہے۔ یا یوں ہی ان لوگوں نے آسمان

سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ آیا روح القدس درحقیقت کوئی ایسا "جانور" ہے۔ جو آسمانوں کے اوپر رہتا اور وقتاً فوقتاً زمین پر اتر کر کنواری لڑکیوں کو بدنام کرتا رہتا ہو۔ اگر وہ درحقیقت کوئی ایسا وجود ہے۔ تو وہ ایک خطرناک وجود سمجھنا چاہئے۔ لیکن اگر ہم ذرا عقل و فکر سے کام لیکر جہل و تعصب کے اُن پردوں کو جو کہ مذہبی خانقاہوں کے مجاوروں نے جیسا کہ ہم اس مضمون کے عین دیباچہ میں ہی لکھ آئے ہیں۔ ڈال رکھے ہیں۔ مذہب کے چہرے پر سے ہٹا کر اندر نظر ماریں۔ تو ہمیں روح القدس کے سچے درشن نصیب ہونے کچھ بھی مشکل نہیں رہتے۔ اور ہم فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ یہ سب کھیل حضرتِ انسان کے دماغ کی اختراع اور اُس کے اپنے ہی خیالات کا عکس ہے۔ نہ کوئی اس قسم کا روح القدس ہے۔ جو کہ اس طرح معصوم لڑکیوں کی پردہ دری کرتا پھرتا ہو۔ نہ ہی کوئی ایسی لڑکیاں ہی ہیں۔ جو کہ روح القدس سے حاملہ ہو کر دنیا کو نجات دہندوں سے فیضیاب کرتی پھرتی ہوں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ شخصی مذاہب کے مقلدوں نے اپنے اپنے مذہب کے بانیوں کو ایسا بانس پر چڑھایا۔ اور اُن کی ذات بابرکات کو ایسا مقدس ٹھیرایا۔ کہ اُن کے لئے مشکل ہو گیا۔ کہ وہ اُن کو انسانوں کی اولاد ظاہر کرتے۔ اگر اُن کے اختیار میں ہوتا۔ تو وہ یہاں تک کر گذرنے کے لئے تیار تھے۔ کہ اُن کی ماتاؤں کے وجود سے بھی انکار کر دیتے۔ اور بعض صورتوں میں ایسا کیا بھی گیا۔ دور کیوں جاتے ہو۔ بھگت کبیر کے مقلد کبیر کو نہ صرف بے باپ کا بچہ ہی بناتے ہیں۔ بلکہ اُس کی ماں کے وجود سے بھی انکار کر کے اس کو پھولوں سے پیدا شدہ مانتے ہیں۔ انسان کی غیریت کا درحقیقت کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتے۔ کہ جس وجود کو وہ اپنا نجات دہندہ یا قابل پرستش مان رہے ہیں۔ اس کو ایک مرد کے نطفہ سے پیدا شدہ تصور کر لیں۔ یا کوئی شخص ان کو یہ کہہ سکے۔ کہ تمہارا نجات دہندہ فلاں آدمی کا بیٹا یا اس کی ماں کا فلاں شخص

"خاوند" تھا۔ یہ خصم کا لفظ اپنے اندر کچھ ایسی خصوصیت رکھتا ہے۔ کہ غیرت مند مذہبی پوجاری سر سے ہی اس کی جڑ کاٹتے چلے آئے ہیں۔ راجپوتوں نے اس لفظ کو اس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ کہ انہوں نے اپنی لڑکیوں کو جان سے مار ڈالنا بہتر سمجھا۔ بہ نسبت اس کے کہ کوئی اُن کا داماد بن کر اُن کی لڑکیوں کا "خصم" کہلائے۔ عیسائیوں نے بعینہ اسی راجپوتی سپرٹ سے کام لیا۔ انہوں نے نہ صرف عیسےٰ کے حقیقی باپ کو ہی ولدیت کے حقوق سے بیدخل کر دیا۔ بلکہ جو عیسائی لوگ یہ کہتے تھے۔ کہ ہماری ماں مریم کا "خاوند" ضرور تھا۔ اور کہ عیسےٰ روح القدس کا بیٹا نہیں۔ بلکہ اسی مرد کا بیٹا تھا۔ اُن کو بھی جان سے مار ڈالا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی کفر کی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ وہ ایک ترکھان کو جس کا نام یوسف تھا۔ خداوند کا داماد یا خداوند کی لڑکی کا خاوند یا خود خداوند مسیح کا باپ بتا کر دنیا میں الحاد کا پرچار کریں۔ باوجود اس تمام کشت و خون کے جو کہ عیسائیت کے عین ابتدا میں اسی جھگڑے پر ہوا۔ اور باوجود اس تمام ردوبدل کے جو کہ عیسائی لوگوں نے انجیل کے مختلف نسخوں میں کی۔ ان کو پھر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ آج ہم اسی مضمون پر بحث کرنا چاہتے ہیں *

ہم پیچھے لکھ آئے ہیں۔ کہ مذہبی مجاور جس قسم کے روح القدس کا شور مچاتے چلے آئے ہیں۔ وہ اُن کے اپنے ہی دماغ کی اختراع ہے۔ لیکن اگر ہم عیسائی دنیا کے روح القدس کا وجود مان بھی لیں۔ تو ہمیں فوراً کہنا پڑیگا۔ کہ عیسائی دنیا کا روح القدس یوسف نجار کے سوائے اور کوئی نہیں تھا۔ یوسف نجار (بڑھئی) کے درشن ہی اصلی معنوں میں عیسائی روح القدس کے درشن ہیں۔ یہ کوئی مذاقیہ بات نہیں ہے۔ بلکہ اناجیل خود اس بات کی شہادت دے رہی ہیں۔ کہ روح القدس اگر کوئی تھا۔ تو وہ محض یوسف ترکھان ہی تھا۔ عیسائیوں کے خداوند کا

باپ بھی یہی یوسف تھا۔ گو ہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ کہ چونکہ عیسائیوں کے خداوند کا باپ بڑھئی تھا۔ اس لئے ان کا خداوند بھی کوئی بڑھئی ہی تھا۔ نہیں ایسا کہنا بے ادبی ہے۔ ہاں ہم اس رشتہ داری کی بنا پر اس قدر ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کہ خداوند خدا نے اپنی اکلوتی لڑکی کے لئے ایک نیک بخت خاوند پسند کیا۔ ایسا خاوند کہ جس کا ذکر اس نے اپنے کلام پاک میں بھی کر دیا۔ اور جگہ بہ جگہ کر دیا۔ انجیل ہمیں بتا رہی ہے۔ کہ خداوند خدا کا باپ یہی نیک مرد تھا۔ چنانچہ متی کی انجیل میں یوں درج ہے :-

"اور ایسا ہوا۔ کہ جب یسوع یہ تمثیلیں کہہ چکا۔ تو وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ اور اپنے وطن میں آکے اُس نے اُن کے عبادتخانے میں انہیں ایسی تعلیم دی۔ کہ وے حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ ایسی حکمت اور معجزے اُس نے کہاں سے پائے۔ کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں۔ اور اُس کی ماں مریم نہیں کہلاتی۔ اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسیس اور شمعون اور یہوداہ اور اُس کی سب بہنیں ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ پس اس نے یہ سب کچھ کہاں سے پایا۔ متی $\frac{۱۴}{۵۴}$"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عیسائیوں کا خداوند اکیلا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس کے چار بھائی اور کئی بہنیں اور بھی تھیں۔ جو کہ خداوند کے ساتھ ہر ایک بات میں شریک تھے۔ اعتراض ہو سکتا ہے۔ کہ یہاں پر غیر لوگوں نے مسیح کی ابنیت کو ایک بڑھئی کی طرف منسوب کیا ہے۔ ممکن ہے۔ ان کا کہنا غلط ہو۔ مگر جب لوقا کی انجیل میں یہ بیان موجود پایا جاتا ہے۔ تو پھر شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

"اس کے ماں باپ ہر برس عید فسح میں یروشلم کو جاتے تھے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا۔ اور وے عید کے دستور پر

یروشلم کو گئے تھے۔ تو لڑکا یسوع یروشلم میں رہ گیا۔ مگر یوسف اور اُس کی ماں نے نہ جانا۔ بلکہ یہ سمجھکر کہ وہ قافلہ میں ہے۔ ایک منزل آگے نکل گئے۔ اور اسے رشتہ داروں اور جان پہچانوں میں ہر جگہ ڈھونڈا۔ اور نہ پاکر اُس کی تلاش ہر جگہ کرتے ہوئے یروشلم کو پھرے۔ اور ایسا ہوا۔ انہوں نے تین روز پیچھے اسے ہیکل میں اوستادوں کے بیچ میں بیٹھے ہوئے اُن کی سنتے اور اُن سے سوال کرتے پایا۔ اور سب جو اُس کی سنتے تھے۔ اُس کی سمجھ اور اُس کے جوابوں سے دنگ تھے۔ تب وے اسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ اور اُس کی ماں نے اُس سے کہا۔ اے بیٹے! کس لئے تو نے ہم سے ایسا کیا دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے۔ لوقا ۳/۴۸-۴۹"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یسوع مسیح فرضی روح القدس کا بیٹا نہیں تھا۔ بلکہ جیسا کہ اس کی ماں کے الفاظ ہوتا ہے۔ یوسف ہی اس کا حقیقی باپ تھا۔ کیا ہم یہ مان لیں۔ کہ مسیح کی ماں نے غلط بیانی کی ہے۔ ہمیں ایسا ماننے کے لئے کوئی بھی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ عورت اچھی طرح جانتی ہے۔ کہ آیا میں اپنے خاوند سے وفادار رہی ہوں۔ یا میں نے اس کے بستر کا وشواس گھات کیا ہے۔ پس مریم کا اپنی زبان سے یوسف کو عیسےٰ کا باپ کہنا ایک زبردست اندرونی شہادت ہے۔ اور مریم اُن تمام گناہ کے الزامات سے جو کہ اُس پر عیسائیوں یا غیر عیسائیوں کی طرف سے لگائے جاتے ہیں۔ بری ٹھہرتی ہے۔ مگر ایک بات اور بھی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ عیسےٰ درحقیقت یوسف کے نطفہ سے ہی پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ عیسےٰ کو ابن داؤد یا داؤد کی نسل سے بتایا گیا ہے۔ چنانچہ متی اور لوقا کی اناجیل میں عیسےٰ کا حسب نسب مریم کے ذریعہ داؤد سے نہیں ملایا گیا۔

بلکہ یوسف کے ذریعہ ایسا کیا گیا ہے۔ اگر مسیح یوسف کے نطفہ سے نہیں
تھا۔ تو اناجیل کا یہ کہنا کہ وہ داؤد کے گھرانے میں پیدا ہؤا۔ یا وہ ابن داؤد
تھا۔ قطعی غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ داؤد کی نسل میں ہونے کے لئے ضروری
ہے۔ کہ اُس کو داؤد کی نسل کے آخری ممبر یعنی یوسف نجّار کے نطفہ سے مانا
جاوے۔ یہ ایک لغزش ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پادریوں
نے یہ ملاوٹ بعد میں کی ہے۔ ہم کسی صورت میں بھی ماننے کے لئے تیار نہیں
ہیں۔ کہ متی جیسا دیانت دار آدمی جو بہ نفس نفیس مریم کے پاس مدت تک
رہا۔ وہ خود ایسی لغزش کرتا خاصکر اُس صورت میں جبکہ مریم خود بھی یوسف
کو اپنا خاوند اور مسیح کا باپ مانتی تھی۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ مریم نے اپنا
سارا حال متی کو نہ بتایا ہو۔ یہ ایک ایسی سر توڑ لغزش ہے۔ جس کا جواب
آج تک تمام عیسائی دنیا سے نہیں بن پڑا۔ مگر معلوم ہے۔ کہ جہاں عیسائی
دنیا نے متی اور لوقا کی انجیلوں کو الٹ پلٹ کیا۔ وہاں اتفاق سے وہ مرقس
کی انجیل پر ہاتھ صاف نہ کر سکے۔ مرقس نے اس قسم کی لاف و گزاف سے کہ
مسیح داؤد کی نسل سے تھا۔ ہرگز کام نہیں لیا۔ بلکہ اُس نے بڑی سادگی سے
قبول کیا ہے۔ کہ روح القدس مریم کے پیٹ میں داخل نہیں ہؤا تھا۔ بلکہ
کبوتر کی شکل میں لڑھکنیاں کھاتا ہؤا خود مسیح پر ہی نازل ہؤا تھا۔ مرقس
نے بیت اللحم یا مسیح کی انوکھی پیدائش کے بارے میں ایک لفظ تک بھی
نہیں لکھا۔ پہلی اور دوسری نسل کے تمام عیسائی عیسےٰ کو یوسف کا بیٹا
ہی کہتے تھے۔ وہ روح القدس کو اُس کا باپ نہیں گردانتے تھے۔ اور اگر سچ
پوچھو۔ تو وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ عبرانی زبان میں روح القدس
کے لئے جو لفظ استعمال ہؤا ہے۔ وہ مونث ہے۔ ابتدائی عیسائیوں کا جو کہ
یہودیوں میں سے تھے۔ یہ اول درجہ کا پاگل پن سمجھا جاتا۔ اگر وہ ایک مونث
وجود کے ذریعہ مریم کے شکم سے مسیح کی پیدائش کا مسئلہ گھڑتے۔ یا اس مونث

وجود کو مریم کا خصم اور مسیح کا باپ کہتے - درحقیقت یہودیوں کی اس حرکت
سے بڑھ کر اور کوئی بھی لغو اور لچر حرکت نہ ہوتی - پس یہ صاف ظاہر ہے - کہ
عیسے کو روح القدس کا بیٹا گھڑنے والے حضرت نہ تو حضرت عیسے کے حواری
تھے - نہ ہی ابتدائی زمانہ کے یہودیوں سے آئے ہوئے عیسائی لوگ - بلکہ یہ
مسئلہ اُس وقت گھڑا گیا - جبکہ عیسائیت یونان وغیرہ میں پھیلی - اور یہ ہم
پہلے ہی بتا چکے ہیں - کہ یونانی اور اطالی لوگوں میں یہ دستور تھا - کہ وہ اپنے تمام
برگزیدہ آدمیوں کو جوپیٹر وغیرہ کے بیٹے کہا کرتے تھے - جوپیٹر اُن کے نزدیک
جاو (Jehovah) یا روح القدس ہی تھا - اس بات کے بتانے کی ضرورت
نہیں - کہ لوتھر وغیرہ کے زمانہ تک اناجیل کے مالک واحد پوپ اور اس کے مقلد
ہی رہے ہیں - اور اس تمام عرصہ تک اناجیل یا تو عبرانی زبان میں مروج رہیں
یا یونانی و لاطینی زبان میں - جس صورت میں کہ یونانیوں اور اطالیہ والوں کو پورا
اختیار تھا - کہ وہ جس طرح چاہیں - اناجیل کی اشاعت کریں - اور جس طرح چاہیں
اُن کو لکھوائیں - یہ کوئی بھی تعجب کی بات نہیں معلوم ہوتی - کہ اُنہوں نے اُن میں
دست اندازی نہ کی ہو - یہی وجہ تھی - کہ پوپ اور اُس کے مقلدوں نے اناجیل
کا غیر زبانوں میں ترجمہ کئے جانے کے عمل کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا - اور
ایسا کرنے والوں کی سخت مخالفت کی - تواریخ خود اس بات کی شہادت دیتی ہے
کہ یونانی اور رومی عیسائیوں نے اناجیل کو توڑ پھوڑ کر اپنے ڈھب کا بنا لیا -
اور جن لوگوں نے ابتدائی باتوں کو اُن کے اصلی رنگ میں محفوظ رکھنے کی کوشش
بھی کی - اُن کو بھی ساتھ ہی توڑ پھوڑ ڈالا گیا - چنانچہ عیسے کی موت کے بعد جب
اُس کے حواری اور رشتہ دار یروشلم میں جمع ہوئے - تو سب نے اس کے وعظ
کی منادی کا عہد کیا - یہ سب سے پہلی کونسل تھی - جو کہ عیسائیوں نے دین
عیسوی کو پھیلانے کے لئے کی - اس کونسل میں طے شدہ باتوں کا پرچار کرنے
کے لئے مسیح کے غریب مقلد چاروں طرف پھیل گئے - ان ابتدائی مقلدوں

کو یہودی لوگ حقارت کی وجہ سے نصرانی یا ابی نائیطس کہتے تھے۔ کیونکہ مسیح خود
ناصرت گاؤں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ابی نائیطس کے معنی غریب آدمیوں
کے ہیں۔ نصرانی کے معنے مسیح ناصری کے پیرو کئے جاتے ہیں۔ مسیح کے بارے
میں ان لوگوں کے اعتقادات بڑے سیدھے سادے تھے چنانچہ پادری یسوبیس
جو کہ ۲۶۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور پہلا عیسائی مورخ تھا۔ نصرانیوں یا ابی
نائیطس لوگوں کی تواریخ لکھتا ہوا بیان کرتا ہے۔ کہ ابی نائیطس لوگ بڑے غریب
اور منکسر المزاج ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے۔ کہ مسیح ایک بڑا سیدھا سادا اور عام
آدمیوں کی طرح آدمی تھا۔ اُس کی پیدائش بھی عام انسانوں کی طرح مریم
اور یوسف کے ملاپ سے ہوئی تھی۔ ابی نائیطس لوگوں کے اس اعتقاد کی بنیاد
متی کی انجیل تھی۔ متی عیسے کا مصاحب خاص اور اُس کے حواریوں میں برگزیدہ
تھا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس کو مسیح اور مریم سے بات چیت کرنے کا شرف
حاصل تھا۔ جب اُس نے اپنی انجیل لکھی۔ تو ہر ایک بات اُس کے ذہن میں
تازہ تھی۔ اُس کو کیا ضرورت پڑی تھی۔ کہ وہ واقعات کو چھپاتا یا اُن کو غلط
پیرایہ میں بیان کر کے اپنے ساتھیوں کو دھوکہ دیتا۔ اگر متی نے اپنی انجیل
میں ایسا لکھا ہوتا۔ تو پولوس رسول ضرور اُس کی پیروی کرتا۔ مگر پولوس نے
اپنے خط میں جو کہ اُس نے رومیوں کو روانہ کیا تھا۔ اس بات کا صاف اقرار
کیا ہے۔ کہ یسوع مسیح جسم کے لحاظ سے داؤد کی نسل سے تھا۔ مگر مقدس
روح کی نسبت قدرت کے ساتھ اُس کے جی اُٹھنے کے بعد خدا کا بیٹا ثابت
ہوا وغیرہ وغیرہ۔ پولوس اُس کو جسم کے لحاظ سے داؤد کی نسل سے ہرگز نہ
بتاتا۔ اگر متی کی سند اس کے پاس موجود نہ ہوتی۔ مگر معلوم ہوتا ہے معلوم
کیا بلکہ یہ امر واقعہ ہے۔ کہ متی کی انجیل کو ادل بدل کیا گیا۔ یہاں تک
کہ جو لوگ متی کی پہلی انجیل کے مطابق اعتقاد رکھتے تھے۔ اُن کو بھی حقارت
کی نظر سے دیکھا گیا۔ چنانچہ نصرانیوں یا ابی نائیطس لوگوں کو جو یہ مانتے

تھے - کہ مسیح دوسرے انسانوں کی طرح یوسف اور مریم کے ملاپ سے پیدا
ہوا تھا - یہودیوں سے آئے ہوئے عیسائی لوگ ملحد اور مصر اور روم کے عیسائی
کافر کہتے تھے - کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں - روم - مصر اور یونان وغیرہ
میں دیوتاؤں کی اولاد ہونے کا فخر عام طور پر ترقی پر تھا - اب تو ان نصرانی یا
ابی نائیٹس لوگوں کی شامت آگئی - اُن کو مجبور کیا گیا - کہ وہ اس اعتقاد
سے باز آجائیں - جو باز آگئے - وہ بچ گئے - باقی سب جان سے ہلاک کر
ڈالے گئے - اُن کی ہلاکت کے ساتھ ہی متی کی اصلی انجیل بھی خاک میں
مل گئی - گبن صاحب تواریخ روم میں ان مظلوموں کا ذکر کرتے ہوئے
فرماتے ہیں - کہ ان کے معبد تباہ کر دئے گئے - ان کی کتابیں جلا دی گئیں -
اور اُن کو انواع و اقسام کی اذیتیں دی گئیں - وہ لوگ مسیح کو عام آدمیوں
کی طرح ایک نیک آدمی تصور کرتے تھے - اور اُس کو انسانوں سے بڑھ کر
خدا کا مرتبہ دینے کے لئے تیار نہیں تھے - نصرانیوں کا یہ عقیدہ مدت تک
جاری رہا - یہاں تک کہ آخر کار ان لوگوں کی تباہی کے بعد پادریوں نے
مسیح کو نہ صرف خداوند کا بیٹا ہی بنا دیا - بلکہ اس کو بذاتہ خداوند مان بیٹھے
لارڈنر صاحب فرماتے ہیں - کہ ابی نائیٹس کی طرح ابتدائی عیسائیوں
میں ایک اور فرقہ بھی تھا - جن کو کارپوکریشین کہتے تھے - اس فرقہ کا بانی
کارپوکریٹس تھا - ان کا بھی یہی اعتقاد تھا - کہ مسیح عام انسانوں کی طرح
پیدا ہوا تھا - مگر وہ نیک تھا - نصرانیوں کی طرح زمانہ مابعد کے عیسائی
کارپوکریشین کو بھی کافروں کے نام سے پکارا کرتے تھے - ان لوگوں کا اعتقاد
تھا - کہ جو کچھ ہم کو مسیح کے حواریوں اور رسولوں نے بتایا ہے - ہم اسی پر
عمل کرتے ہیں - اور کہ حواریوں اور رسولوں کے یہی اعتقادات تھے - جو کہ ہم
رکھتے ہیں - اور یہی سچی باتیں ہیں - یہ صداقت دو نسلوں تک جاری رہی -
اور روم کے تیرھویں بشپ وکٹر کے زمانہ تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی -

مگر اس کے جانشین زفیرائیس کے وقت اس میں ردّوبدل اور مختلف تغیرات ہو گئے - چنانچہ لیسوبیس آرٹیمن اور اُس کے مقلدوں کا ذکر کرتا ہوا عیسےٰ کے خداوند کا بیٹا ہونے کے بارے میں ان لوگوں کے اعتقادات کا یوں بیان کرتا ہے :-

"ان کا عقیدہ ہے - کہ ہمارے تمام بزرگوں اور تمام رسولوں کی یہی رائے تھی - جو کہ ہم رکھتے ہیں - اور انہوں نے ہم کو ایسی ہی تعلیم دی تھی - اور کہ اس سچی تعلیم کی صداقت وکٹر کے زمانہ تک جو کہ پطرس نبی کے بعد روم کا تیرھواں بشپ تھا جاری رہی - مگر زفیرائیس نے اس میں سخت تحریف کر دی" ÷

کارپوکریشین عیسائیوں کی طرح ایک دوسرا گروہ عیسائیوں کا بھی یہی اعتقادات رکھتا تھا - اس گروہ کو سیرنتھین کہتے تھے - اور اُن کے بانی سیرنتھس کا یہ عقیدہ تھا - کہ عیسےٰ یوسف اور مریم کے ملاپ سے عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا تھا - یہ غلط ہے - کہ وہ کنواری کے بطن سے پیدا ہوا - مگر اُس کا خیال تھا - کہ عیسےٰ مسیح دوسرے انسان کی نسبت زیادہ پاک اور مقدس تھا ÷

اسی طرح عیسائیت کے ابتدائی زمانہ میں دالیسطس عیسائیوں کا ایک گروہ اور بھی تھا - جو کہ ایشیا کے مختلف حصّوں میں پھیلا ہوا تھا - ان لوگوں کا بھی یہی خیال تھا - کہ عیسےٰ کنواری مریم سے پیدا نہیں ہوا - بلکہ اُس کا باپ یوسف تھا - لارڈنر صاحب فرماتے ہیں - کہ جب ان پُرانے ٹائپ کے عیسائیوں کا نئے ٹائپ کے عیسائیوں سے مقابلہ ہوا - تو بڑی گڑبڑ مچ گئی - اور بہت سے کشت و خون ہوئے - آخر نئے ٹائپ کے عیسائیوں کا پلہ بھاری رہا - اور اُن کی بات چل گئی - پس عیسےٰ بجائے یوسف کا بیٹا کہلانے کے روح القدس کا بیٹا مشہور کیا گیا - پانچویں صدی عیسوی میں نہ صرف

وہ روح القدس کا بیٹا ہی کہلانے لگ گیا۔ بلکہ تثلیث کے مسئلے نے بھی زور پکڑا۔ اور عیسے مسیح کو خدا کے درجہ تک پہنچا کر باپ۔ بیٹا۔ روح القدس کا جھنڈا بلند کر دیا گیا +

مذکورہ بالا مختصر سے بیان سے اتنا پتہ تو ضرور لگتا ہے۔ کہ مسیح بذات خود روح القدس کا بیٹا ہونے سے منکر تھا۔ نہ صرف وہی بلکہ اُس کی ماں۔ اس کے حواری۔ اس کے رسول۔ غرضیکہ اس کے تمام یار و آشنا یہاں تک کہ اُس کی موت کے ڈھائی سو سال بعد تک کے عیسائی لوگ بھی اس کو معمولی انسانوں کی طرح یوسف اور مریم کے ملاپ سے پیدا شدہ مانتے رہے۔ مگر اُس کے بعد تاریکی چھا گئی۔ اور اصلیت الٹ پلٹ ہو گئی۔ اس ہنگامے میں باپ کو بیٹے کی خبر نہ رہی۔ نہ بیوی کو خاوند کی۔ بلکہ ایسا اندھیرا مچ گیا۔ کہ کسی کا بیٹا کسی کے سر تھوپ دیا گیا۔ غرضیکہ ایسا ہلڑ مچا۔ کہ الامان والحفیظ۔ یہ تو ہوئی ایک روح القدس کی کہانی۔ اب آگے دیکھئے گا کیسی دھکا پیل ہوتی ہے +

ہندو محمڈن پرابلم

اُس وقت ہندوستان کی پولٹیکل آزادی کے راستہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اگر کوئی رکاوٹ نظر آتی ہے۔ تو وہ ہندو مسلمانوں کی باہمی ناچاقی ہے۔ اگر گورنمنٹ انگریزی کو ہندوستان میں اپنی حکومت کے استحکام کے لئے کوئی روشن امید نظر آتی ہے۔ تو وہ محض ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی رنجش ہے۔ ملک کے خیر اندیش کوشش کر رہے ہیں۔ کہ کسی طرح یہ رخنہ کم اور آہستہ آہستہ بھرتا چلا جاوے۔ دوسری طرف یہ کوشش ہو رہی ہے۔ کہ کسی طرح یہ پاٹ دن بدن وسیع ہوتا چلا جاوے۔ اگر ہم گورنمنٹ کی کوششوں کو نظر انداز کر دیں۔ تو پھر دوسری طرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے۔ کہ ہندو اور مسلمان اس پہلو میں کیا کوشش کر رہے ہیں۔ کیا دونو اس بات کی خواہش رکھتے ہیں۔ کہ وہ مل کر کام کریں۔ اور ملکر گورنمنٹ سے حقوق مانگیں؟ اگر ان میں سے کوئی اس ملاپ سے بغاوت کرتا ہے۔ تو کیوں کرتا ہے۔ آیا اس میں قصور مسلمانوں کا ہے یا ہندوؤں کا۔ اس بات کو جاننے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ طرفین کی بات سن لی جاوے۔ ہندوؤں کے مسلمہ پولٹیکل لیڈر آنریبل مسٹر گوپال کرشن گوکھلے نے اسی سوال کے حل کے بارے میں لاہور میں لیکچر دیا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اس وقت ہمارے سامنے ہندوستان کی آئندہ ترقی کے بارے میں مختلف سوالات ہیں۔ ان سب میں سے زیادہ ضروری سوال ہندو مسلمانوں کا سوال ہے۔ اسی کے حل پر ہندوستان کی آئندہ کی بہبودی منحصر ہے۔ اس کے حل کرنے میں بڑی ہوشیاری۔ بردباری اور تمیز

سے کام لینا چاہیئے۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی پڑا رہا۔ جیسا کہ موجودہ حالت میں ہے۔ تو ہم اس مقصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکینگے۔ جس کو کہ ہم مدنظر رکھتے ہیں۔ خواہ دوسرے پہلوؤں میں ہماری سرگرمی۔ حب الوطنی کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر یہ سوال حل کرنا چاہیئے۔ اس سوال کے حل ہونے کی دیر ہے۔ پھر ہمارے ملک کا مستقبل محفوظ ہو جائیگا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تعصب یا کسی قسم کے جوش سے مبرا ہو کر اس مسئلہ پر وچار کیا جاوے۔ میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ بھی اسی طرح میرا ساتھ دینگے۔ میں گزشتہ پر نظر مار کر یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کہ آیا قصور مسلمانوں کا ہے۔ یا ہندوؤں کا۔ ہاں موجودہ واقعات کو دیکھ کر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں۔ کہ حالات تسلی بخش نہیں ہیں۔ میں پہلے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کہ موجودہ صورت میں ان دونو فریقوں کا باہمی کیا تعلق ہے۔ بعض باتوں میں ان میں سے ہر ایک فرقہ دوسرے سے افضل ہے۔ اور بعض میں دوسرا فرقہ افضل ہے۔ مثلاً اگر تعداد۔ تعلیم اور دولت کے لحاظ سے دیکھا جاوے۔ تو ہندو مسلمانوں سے افضل ہیں ہندوؤں سے میری مراد اُن لوگوں سے ہے۔ جو کہ اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں۔ ان میں سکھ اور مختلف سماجوں کے آدمی بھی شامل ہیں۔ ہمارے مسلمان بھائی ہندوستان کی کل آبادی کا چوتھائی حصہ ہیں۔ یعنی اُن کی آبادی ۶ اور ۷ کروڑ کے درمیان ہے۔ باقی ۲۱ کروڑ ہندو ہیں۔ مگر ہندو مختلف فرقوں اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اس قدر تقسیم شدہ ہیں۔ کہ اُن کو کسی خاص مقصد کے لئے ایک مرکز پر لانا بڑا مشکل ہے۔ دونوں گروہوں کی آبادی مختلف طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہے۔ کہ دو صوبوں میں تو مسلمان ہوں۔ اور باقی کل حصوں میں ہندو نہیں بلکہ ہر ایک صوبہ میں ہندو اور مسلمان ایک خاص مقدار میں موجود ہیں۔ مثلاً پنجاب میں ہندو اور مسلمان دونوں کی آبادی برابر ہے۔ بنگال میں دو تہائی ہندو اور ایک تہائی مسلمان ہیں۔ بمبئی میں

پانچواں حصہ اور صوبجات متحدہ میں ساتواں حصہ مسلمان ہیں۔ مدراس میں
مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا پندھواں حصّہ ہے۔ اور صوبجات متوسط میں
مسلمان کل آبادی کا پچیسواں حصّہ ہیں۔ نئے انتظام کے مطابق آسام اور
مشرقی بنگال میں مسلمان آبادی ۳/۵ حصّہ ہے۔ یہ تو مسلمانوں کی آبادی کی
کیفیت ہے۔ اس سے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ کہ سوائے پنجاب اور نئے مشرقی
بنگال کے صوبے کے مسلمانوں کی آبادی دیگر صوبوں میں بہت ہی کم ہے۔ مگر
باوجود کم ہونے کے وہ کسی ایک مقصد کے لئے جمع ہوجانے کی خاص طاقت
رکھتے ہیں۔ اگر تعلیم کے لحاظ سے دیکھا جاوے۔ تو بھی ہندوؤں کا پلڑا بھاری نکلیگا +
ہر ایک مہذب ملک میں گورنمنٹ اپنا فرض سمجھتی ہے۔ کہ رعایا کو تعلیم
دے۔ مگر ہندوستان میں معاملہ ہی دگرگوں ہے۔ ہندوستان کے فی دس
لڑکوں میں سے ایک لڑکا ان پڑھ اور فی سات گاؤں میں سے ایک گاؤں بغیر
سکول کے رہتا ہے۔ ہمارے لڑکے تقریباً سب کے سب جاہل مطلق رہتے
ہیں۔ اگر پڑھے لکھے آدمیوں کا شمار کیا جاوے۔ تو ہندوؤں میں فی بیس
آدمی ایک آدمی ایسا نکلیگا۔ جو کہ مادری زبان لکھ پڑھ سکتا ہو۔ اور مسلمانوں
میں فی تیس آدمی ایک آدمی مادری زبان لکھنے پڑھنے والا ملیگا۔ یہ تو ہوا
ابتدائی تعلیم کا حال۔ اگر اعلےٰ درجہ کی تعلیم کا اندازہ لگایا جاوے۔ تو معلوم ہوگا
کہ فی تین سو ہندوؤں میں سے ایک ہندو اور فی چھ سو مسلمانوں میں سے ایک
مسلمان انگریزی لکھ پڑھ سکتا ہے۔ دولت کے لحاظ سے اگرچہ کوئی صحیح
صحیح مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جہاں تک عام حالت پر نظر ماری
جاتی ہے۔ ہندو مسلمانوں کی نسبت زیادہ دولتمند ہیں +

یہ تو ہوا ہندو اور مسلمانوں کا باہمی مقابلہ۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے۔
کہ اگرچہ تعداد۔ تعلیم اور دولت کے لحاظ سے ہندو مسلمانوں سے بڑھکر ہیں۔
لیکن مسلمانوں کو بہت سے ایسے فوائد بھی حاصل ہیں۔ جن سے ہندو بالکل

محروم ہیں۔ ہندو محض ہندوستان میں ہی بند ہیں۔ اُن کو باہر کی کسی سلطنت سے کسی قسم کا سہارا ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اُن کو بدھ مت والوں سے سہارا مل سکتا تھا۔ مگر بدھ مت ہندوستان میں مدت سے مر چکا ہے۔ برعکس اس کے مسلمانوں کو سہارا دینے کے لئے اُن کے بھائی مصر۔ افریقہ۔ ترکی افغانستان چین اور یورپ کے بعض حصوں میں موجود ہیں۔ مسلمانوں کو دوسرا فائدہ یہ حاصل ہے۔ کہ اُن میں "اخوت" کے اصول موجود ہیں۔ اُن میں کوئی شخص بھی نہایت ہی نیچے درجہ سے اُٹھکر چوٹی تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر ہندوؤں کو ذات پات کی قیود نے جکڑ رکھا ہے۔ علاوہ اس کے دونوں گروہوں کے گزشتہ کارنامے ہیں۔ ہندوؤں کے کارنامے زیادہ تر دھرم کے متعلق ہیں۔ اور انہوں نے علم ادب۔ سائنس اور آرٹ میں بہت غضب کا اضافہ کیا ہے۔ مگر مسلمان بھی ان باتوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہے۔ مسلمانوں کی تہذیب دنیا میں ابھی تک تعریف کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کو بہت سے ایسے فوائد بھی حاصل ہیں۔ جن سے ہندو قطعی محروم ہیں۔ مثلاً مسلمان فاتح قوم مشہور ہیں۔ اسلامی فتوحات مغرب میں سپین تک اور مشرق میں چین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ چین سے لیکر سپین تک مسلمانوں میں ایک خاص جوش کام کر رہا تھا۔ اور یہ جوش ان کو ورثہ میں ملا ہوا ہے۔ اور اُن کے سوبھاؤ کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ مگر بعض صورتوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی بہت پستی میں ہیں۔ اور اُن دونوں کو مغرب سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً سماجک لحاظ سے دونوں ہی گرے ہوئے ہیں۔ دونوں میں عورتوں کی پوزیشن ناتسلی بخش ہے۔ دونوں نے ہی انسان کو انسان سمجھ کر برابر کے حقوق دینے کے بھید کو نہیں سمجھا۔ الغرض دونوں فریقوں کی حالت بہت کچھ مساوی ہے۔ اگر وسیع نظر سے دیکھا جاوے تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ جو کہ اُن کو باہم ملکر کام کرنے سے روک

سکے - برعکس اس کے بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں - جن کو لے کر وہ ملکر کام کر سکتے ہیں - ہم ایک ہی گورنمنٹ اور ایک ہی قوانین کے مطیع ہیں - اور ایک ہی قسم کے حقوق کے مستحق - مگر ہمارے مل کر کام کرنے کے راستے میں چند ایک رکاوٹیں ہیں - اور وہ رکاوٹیں طرفین کے پرانے زمانہ کی کدورتیں ہیں - جو اُن کو ملنے نہیں دیتیں - ان کدورتوں کے متعلق خاص روائتیں ہیں - یہ روائتیں کیا ہیں - ہم جانتے ہیں - کہ مسلمان مذہبی جوش سے بھرے ہوئے ہندوستان میں آئے - وہ فتوحات کرتے اور لوگوں کو مسلمان بناتے چلے گئے - دو تین صدیوں تک ایسا ہی ہوتا رہا - جب اکبر تخت نشین ہوا - تو اُس نے دیکھا - کہ مسلمانوں کی سلطنت کو ہندوستان میں مستحکم کرنے کے لئے مذہبی آزادی اور عقلمندی سے کام کرنے کی ضرورت ہے - چنانچہ اکبر نے اسی پولیسی سے کام کرنا شروع کیا - جس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ اُس نے ہندوؤں کی ہمدردی کو حاصل کر لیا - جہانگیر اور شاہجہان نے بھی اُس کی پولیسی کی پیروی کی - یہی زمانہ سلطنت مغلیہ کے عروج کا زمانہ تھا - اس کے بعد یہ پولیسی ترک کر دی گئی - جس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ مسلمانوں کی طاقت زوال پذیر ہو گئی - ہندو مضبوط ہو گئے - مرہٹے - راجپوت اور سکھ ملک گیری کے میدان میں اُتر آئے - ہندوؤں نے چاروں طرف خودسری اختیار کر لی - اور مسلمانی طاقت کا خاتمہ ہو گیا - یہ ایک تواریخی واقعہ ہے - ہندوؤں نے اپنی مختلف سلطنتیں قائم کر لیں - مگر بیشتر اس کے کہ ہندو اپنی سلطنتوں کو مضبوط کر سکتے - یا مسلمان اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے - انگریزوں نے بیچ میں دخل دیدیا - اور خود حاکم بن گئے یہ اس وقت کا واقعہ ہے - جبکہ ہندو مسلمانوں میں مذہبی نفاق کی آگ سلگ رہی تھی - اور وہ ایک دوسرے سے روکش ہو رہے تھے - یہ آگ ابھی تک برابر سلگ رہی ہے - اور اس کو بجھانے کے لئے کوئی کوشش نہیں

کی گئی۔ یہی اختلاف کی وجہ ہے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے پر بھروسا نہیں کرتے۔ نہ ہی کوئی اُن کی اس آپس کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے۔ کہ وہ مل کر کام کریں۔ اگر وہ مل کر کام نہیں کرینگے تو دونو ہی نقصان اُٹھائینگے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ دونوں فریقوں میں چند مخالف طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ مگر بعض ایسی طاقتیں بھی ہیں۔ جو اُن کو باہمی ملانے کا کام کر رہی ہیں۔ جو لوگ اس اتفاق کو پیدا کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اُن کو یہ کام برابر جاری رکھنا چاہئے۔ تاوقتیکہ پورا اتحاد نہ ہو جاوے ہمیں اپنا سارا زور ان دونوں فریقوں کو متفق کر دینے میں لگا دینا چاہئے۔ طرفین کی کدورتیں ہیں۔ مگر وہ ملنا بھی چاہتے ہیں۔ اور اتفاق کی ضرورت کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ بہت سا کام ہو چکا ہے۔ مگر جو باقی ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لئے کونسے وسائل اختیار کئے جائیں۔ میں یہاں پر صرف تین یا چار ایسے علاج بتاؤنگا۔ جن سے یہ اتفاق پیدا ہو سکتا ہے:۔

اوّل۔ طرفین میں قومی تعصب اور مذہبی عناد کو دور کرنے کی سچی خواہش ہونی چاہئے۔ اس کے بغیر کوئی بھی مفید کام نہیں ہو سکتا۔ جس قدر دونوں فریق اپنی موجودہ حالت پر زیادہ غور کرینگے۔ اور اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرینگے۔ اسی قدر اتحاد کا ہونا جلدی ممکن ہوگا *

دوم۔ دونوں فریقوں کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے۔ کہ یہ معاملہ دونوں کے ننگ و ناموس کا معاملہ ہے۔ اس میں دونوں برابر ہیں۔ ممکن ہے۔ آپ میں سے بہت سے آدمی حکام بالادست کی طرفداری کرنا پسند کریں۔ اور بہت سے آدمی آپ کو اپنی طرف کھینچنا چاہیں۔ مگر جو لوگ ملک کے سچے خیر خواہ اور آزادی کے خواہاں ہیں۔ وہ آپ سے نفرت کرینگے۔ ممکن ہے۔ آپ کے ساتھ رعایت ہو جاوے۔ مگر رعایت کی خاص حد ہوتی ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ملیگی۔ یہ محض ہندو ہی نہیں ہیں۔ جن کو کہ بعض تکالیف

کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسلحہ ایکٹ کا اثر صرف ہندوؤں پر ہی نہیں پڑا۔ بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں پر ہی پڑ رہا ہے۔ اگر تم جنوبی افریقہ میں جاؤ۔ تو دیکھو گے کہ وہاں صرف ہندوؤں کو ہی بازاروں میں پھرنے یا اول درجہ کی گاڑی میں سوار ہونے سے نہیں روکا گیا۔ بلکہ مسلمانوں کو بھی روکا گیا ہے۔ پس دونوں فریقوں کو سمجھ لینا چاہئے۔ کہ اُن کی موجودہ حالت تہذیب سے لگا نہیں کھاتی۔ اس لئے مسلمان بھائیوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔ کہ ہندو میدان میں لڑیں۔ اور وہ پیچھے کھڑے ہوئے تماشا دیکھتے رہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے۔ کہ ہم ہر ایک حق کے مستحق ہیں۔ جب ہم ایسا محسوس کرینگے۔ تو پھر کوئی فرق نہیں رہیگا۔ کیا آپ اپنی موجودہ حالت پر قانع ہیں؟ یہ میدان اکیلے آدمی کی کوششوں سے نہیں جیتا جا سکتا۔ اس کے لئے متفقہ کوشش کی ضرورت ہے +

سوم۔ حب الوطنی کا سبق سب کو سکھانا چاہئے۔ اے نوجوانو! تم ایک کثیر تعداد میں باہر نکلو۔ اور عوام الناس کو محبت کا سبق پڑھاؤ۔ جب تک ہم جنم بھومی کی سیوا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ہم انسان نہیں کہلا جا سکتے۔ غیر ملکوں میں جا کر دیکھو۔ کہ لوگ اپنے ملک سے کس قدر پیار کرتے ہیں۔ اس کام کے کرنیکی ضرورت ہے۔ جب یہ کام ہو جائیگا۔ تو دونو فریقوں کے آدمی اپنے آپ کو اپنے ملک کی سیوا کرنے کے لئے قربان کر دینے میں دریغ نہیں کرینگے +

چہارم۔ مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں پر ذمہ واری کا بوجھ زیادہ ہے۔ ہندو تعلیم یافتہ ہیں۔ اُن کو زیادہ بردباری سے کام لینا چاہئے۔ یہ چند وسائل ہیں۔ جن کے ذریعہ دونوں فریقوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور دونوں فریق مل کر کام کر سکتے ہیں۔ اگر کشادہ دلی سے اور تعصب سے بری ہو کر کام کیا جاوے۔ تو موجودہ کام قومی طریقہ پہ ہونا ممکن ہے۔ اگر اس کے راستے میں کوئی رکاوٹیں یا ڈر ہوں۔ تو وہ بے بنیاد سمجھنی چاہئیں۔ دوسروں کی کمزوریوں

پر نکتہ چینی کرنا اور اُن کی خوبیوں کو بھول جانا ٹھیک نہیں ہے۔ وسیع دل رکھنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو یہ ڈر ہے۔ کہ وہ تعداد میں تھوڑے ہیں۔ اُن کے نزدیک اگر گورنمنٹ کی موجوہ مطلق العنانی میں فرق آگیا۔ تو اُن کو نقصان پہنچیگا کیونکہ وہ بیس کروڑ ہندوؤں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ مگر میرے خیال میں ۶ کروڑ مسلمان زیادہ مفید ثابت ہو سکینگے۔ کیونکہ ان میں اتفاق ہے۔ بہ نسبت ۲۰ کروڑ ہندوؤں کے جو کہ آپس میں ہی تقسیم شدہ ہیں۔ ساتھ ہی ہماری موجود جد و جہد مذہبی جد و جہد نہیں ہے۔ بلکہ قومی جد و جہد ہے۔ پس ہمارا آئندہ کا انتظام بھی قومی طریقہ پر ہی ہوگا۔ نہ کہ مذہبی طریقہ پر۔ اس صورت میں یہ چھ سات کروڑ مسلمان تمام آبادی کا ایک بڑی ضروری عنصر ہونگے۔ نہیں بلکہ اگر مجھے کہنے کی اجازت ہو۔ تو میں کہونگا۔ کہ وہ ایک ایسا گروہ ہوگا۔ جو تمام ملک پر زیادہ اقتدار رکھیگا۔ دوسری طرف تمام مسلمانوں کو شاہراہ ترقی پر چلنے کے لئے ایک جھنڈے تلے لانے کی جو تحریک ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ تمام حق پسند انسانوں کی ہمدردی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا۔ کہ مسلمان پستی کی حالت میں رہیں۔ اگر مسلمان اپنی گذشتہ عظمت کو واپس لانا چاہیں۔ تو میرے خیال میں ناممکن ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنے کے لئے اُن کو یورپ میں عیسائیوں کے ساتھ جنگ کرنیکی ضرورت پڑیگی۔ جہاں وہ مشکل سے مقابلہ میں کھڑے رہ سکینگے۔ کیونکہ عیسائی اُن کی نسبت زیادہ زبردست ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ ترقی کرنا چاہیں۔ تو اُن کے لئے ایک ہی راستہ ہے۔ اُس کی مثال ترکی کی نوجوان پارٹی موجود ہے۔ مصر والے مصر میں چلا رہے ہیں۔ کہ مصر مصر والوں کے لئے ہے۔ اہل فارس چونک رہے ہیں۔ اور فارس کو فارس والوں کا ہی سمجھ رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی چاہیئے۔ کہ وہ ہندوستان کو ہی اپنا ملک سمجھیں۔ اس صورت میں اُن کو اصلی مقصد میں کامیابی ہونی کچھ بھی مشکل

نہیں ہوگی۔ اگر اسلام کی موجودہ تحریک کا مطلب ٹھیک طور پر سمجھا جاوے۔ تو پھر یہ ہمارے لئے ایک قسم کی طاقت ثابت ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں فریقوں کو اس قسم کے ڈر ہیں۔ لیکن اگر اتفاق سے کام کیا جاوے اور غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔ تو فیصلہ جلدی ہی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں۔ کہ کانگریس کا پلیٹ فارم ہی ایسا ہونا چاہیئے۔ جس پر دونو فریق کھڑے ہو سکیں۔ پس آپ کو اور آپ کے لیڈروں کو کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ وہ اُٹھیں اور ہمارے ساتھ ملیں۔ دونوں کے لئے کام کرنے کا میدان کھلا پڑا ہے۔ دونوں کو ہی قومی طریقے پر کام کرنا چاہیئے۔ اور حتی المقدور اس میں حصہ لینا چاہیئے۔ میں اپنے ہندو بھائیوں سے التماس کرتا ہوں۔ کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں۔ اور زیادہ بردباری دکھائیں۔ ہمارے مسلمان بھائی تعلیم کے لحاظ سے پیچھے ہیں۔ ہندوؤں کو چاہیئے۔ کہ اُن کو تعلیم دیں۔ اگر اور کچھ نہیں۔ تو پرائیویٹ کوشش سے ہی ایسا کرنا چاہیئے۔ پرائیویٹ کوشش بھی اپنا پھل لائیگی۔ اگر کوئی ہندو اکثر مسلمانوں کی سیوا کرنے لگ جاوے۔ تو دس سال کے اندر ہی اس پہلو میں خاصی ترقی ہو جائیگی۔ اسی طرح مسلمان ہندوؤں کی سیوا کر کے ملکی ترقی میں حصہ لے سکتے ہیں *

ہندو آبادی کا چوتھائی حصہ بالکل ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہے ان کا چھونا بھی ہم ناپاک سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں کے ماتھے پر وہ ایک سیاہی کا ٹیکہ ہے۔ عیسائی اس پہلو میں کام کرتے اور کامیاب ہو رہے ہیں۔ اگر جنوبی افریقہ والے ہمارے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کرتے ہوں۔ تو ہمیں شکایت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ جبکہ جنوبی افریقہ کا معاملہ ہمارے اپنے ہاں موجود ہے۔ پہلے اس کو حل کرنا چاہیئے۔ ہم کو ایک دوسرے کے ساتھ ارادت سے پیش آنا چاہیئے۔ یہی میری اپیل ہے"*

یہ تو ہوئی مسٹر گوکھلے کی اپیل۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ اس اپیل کا

جواب مسلمانوں کی طرف سے کیا دیا جاتا ہے۔ مسلمان اس پہلو میں اپیل مجسم ہیں۔ مسٹر گوکھلے کی آواز شاید اتنی دور تک نہیں پہنچی ہوگی۔ جتنی دور تک مسلمانوں کی اپیل مجسم پہنچتی ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ اُن کے نزدیک ہند۔ وخودغرض اور مطلب پرست ہیں۔ جب تک مسلمانوں کا یہ وہم دور نہیں ہوگا۔ تب تک کامیابی کی امید مشکل ہے۔ مسٹر گوکھلے نے مسلمانوں کے اس قسم کے توہمات کی وجہ اُن کی تعلیمی کمی کو گردانا ہے۔ مگر مسلمان اور بھی کئی پہلوؤں میں ہندوؤں کو ملزم گردانتے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا اپنے لئے خطرناک سمجھتے ہیں۔ مسٹر گوکھلے کی سپیچ کو ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے ہونگے۔ کہ "ادھر ٹائمز آف انڈیا" میں مسٹر ظفر علی خاں صاحب کی طرف سے اس مضمون پر ایک زبردست آرٹیکل نکلا۔ جس سے صاف پایا جاتا ہے۔ کہ مسلمان کسی طرح بھی ہندوؤں کے ساتھ راضی نامہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ مسٹر ظفر لکھتے ہیں:۔

"اگر ہندو اور مسلمان اپنے تفرقات کو بھول جائیں۔ تو ہندوستان میں ایک قوم کا بن جانا کوئی بھی مشکل نہیں ہے۔ اگرچہ قوم کا لفظ اس صورت میں اُن پر عائد نہیں ہوسکیگا۔ کیونکہ اس حالت میں وہ دونوں علحدہ علحدہ قومیں رہ کر محض پولٹیکل اغراض کے لئے ہی ایک ہونگے۔ کیونکہ قومیت کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک نسل۔ ایک زبان اور ایک مذہب۔ جو لوگ ان تینوں باتوں میں ایک ہوتے ہیں۔ وہی ملکی اغراض کو لیکر ایک قوم بنا سکتے اور استحکام کے معیار کو حاصل کر سکتے ہیں"

مسٹر ظفر علی خاں اپنے دعوے کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کے لئے یورپ کی قوموں کی مثال دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یورپ والے اب مذہب کو چنداں وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ مذہب کو وہ قومیت کا جز شمار نہیں

کرتے۔ کیونکہ افریقہ اور ہندوستان کے عیسائی لوگ اپنی فاتح قوم کا مذہب اختیار کرنے کے باوجود بھی اُن حقوق سے محروم رہتے ہیں۔ جو کہ فاتح قوم کے لوگوں کو حاصل ہیں۔ مگر مشرق میں مذہب کا بڑا دخل ہے۔ مسٹر ظفر کے نزدیک:۔

"ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑا بھاری فرق مذہب کا ہے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں۔ کہ اگر تمام ہندو ایک دم سے مسلمان ہو جائیں۔ تو تمام تنازعات یک لخت کافور ہو جائیں اور ہندوستان فوراً قوم واحد بن جائے۔ مگر یہ ایک خیال ہی خیال ہے۔ اس لئے ہندوستان میں اتحاد کا عاشق اس کو ٹھنڈی سانس بھر کر نظر انداز کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے"

مگر مسٹر ظفر کو سوال کا دوسرا پہلو نہیں سوجھا۔ اور غالباً ان کو سوجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ اگر تمام مسلمان ایک دم سے ہندو ہو جائیں۔ تو کیا قومیت کا مطلب پورا ہو سکیگا یا نہیں۔ مسٹر ظفر نے شاید اس طرف اس لئے اشارہ نہ کیا ہو۔ کہ اُن کے نزدیک ہندو بہت ہی تنگ دل۔ تنگ خیال اور مسلمانوں سے نفرت کرنے والے ہیں۔ کیونکہ مسٹر ظفر کے نزدیک:۔

"مسلمان اس قسم کی مذہبی تنگ دلی سے قطعی آزاد ہیں تنگدلی اُن کے مذہب کے برخلاف ہے۔ مذہبی تنگدلی اُن کی قومی روائتوں میں نہیں ملتی اسلام سے بڑھکر کوئی دوسرا مذہب آزادی پسند نہیں ہے۔ اسلام کا مشن ہی یہ ہے کہ وہ دنیا میں سے فرقہ بندیوں۔ رنگ و نسل کے تمام تفرقات کو مٹا کر یک رنگی کر دے"۔

مگر افسوس صرف اسی قدر ہے۔ کہ اسلام نے فرقہ بندیوں اور رنگ و نسل کے تفرقات کو تلوار کے زور سے مٹانا چاہا اور مٹانیکی کوشش کی مسٹر ظفر خود اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی رنجش کا کوئی باعث ہؤا ہے۔ تو مسلمانوں کی اس قسم کی سختی ہوئی ہے جس کی طرف مسٹر گوکھلے نے تواریخ کا حوالہ دیتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ اگرچہ مسٹر ظفر کے نزدیک ٹرکی۔ افغانستان۔ ایران کے مسلمان بادشاہ مذہبی آزادی کا دم

بھرنیوالے ہیں۔ مگر ہمارے خیال میں یہ بات حقیقت سے بہت کچھ دور ہے۔ مذہبی جنگ کی تلوار میان میں نہیں کی گئی۔ بلکہ اُس کو چلانے والے بازو کمزور ہوگئے ہیں۔ نہیں۔ بلکہ بازو کمزور کردئے گئے ہیں۔ اور تمام جگہوں پر کمزور کر دئے گئے ہیں۔ مگر مسٹر ظفر کا مذہبی تنگ دلی کے لئے ہندوؤں کو ملزم گردانتا یکطرفہ ڈگری ہے۔ خاصکر جبکہ اُن کی تنگ دلی کا باعث اگر اُس کو تنگدلی کہا جاوے۔ مسلمان ہوئے ہوں۔ مسٹر ظفر کے نزدیک ہندوستان کے دونوں فریقوں میں نسل کے لحاظ سے چنداں اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر ہندوؤں کی ہی نسل سے ہیں۔ اور جو باہر سے آئے ہوئے بھی ہیں۔ وہ بھی اُن میں ہی گھی کھچڑی ہوئے پڑے ہیں۔ مسٹر ظفر کے خیال میں قومیت کا ایک جز تو ہندوستان میں ضرور موجود ہے۔ لیکن تیسرا جز یعنی ایک زبان کا ہونا ایک ایسی چیز ہے۔ جس پر مسٹر ظفر دوبارہ ہندوؤں کو ملزم گرداننے کے لئے تیار ہوئے ہیں۔ مسٹر ظفر کے نزدیک ہندوستان میں اگر کوئی زبان قومی زبان بننے کا حق رکھتی ہے۔ تو وہ محض اردو زبان ہی ہے:۔

"اردو کو اتفاق رائے سے ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں ہے۔ اردو کا دعوے ہندو اور مسلمان دونوں پر یکساں ہے۔ اس کا منبع دونوں عربی اور سنسکرت ہیں علاوہ ازیں فارسی اور انگریزی سے بھی اس کو بہت کچھ نشوونما مل رہی ہے۔ اردو کی پیدائش انگریزی جیسی وسیع زبان سے ملتی جلتی ہے۔ اردو زبان اپنے سامنے ایک عالیشان مستقبل رکھتی ہے۔ اگر تمام تعلیم یافتہ فرقے اردو زبان کو اختیار کرلیں۔ تو تفرقات کی وہ بڑی بھاری حدبندی جو مختلف فریقوں کے درمیان حائل ہے۔ فوراً ٹوٹ جائیگی۔ مگر ہندو اس بات کو محسوس نہیں کرتے۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اور کہ اردو زبان کی ترقی کو روکنا اور بند کرنا چاہیے"۔

قومیت کے اس تیسرے جزو میں بھی مسٹر ظفر نے ہندوؤں کو ہی ملزم گردانا ہے۔ مگر اُن کا یہ خیال قطعی غلط ہے۔ کہ ہندو لوگ اردو زبان کی ترقی کو اس لئے اچھا نہیں سمجھتے۔ کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ قومی زبان بن ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ ہندوستان میں اس وقت جس قدر فرقے ہیں۔ وہ تقریباً سب ہی آریہ بھاشہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ حالانکہ اردو زبان کو سمجھنے والے لوگ چند ایک صوبوں کے ضلعوں تک ہی محدود ہیں۔ آریہ بھاشا میں ایک شخص کشمیر سے لیکر راس کماری تک اور پشاور سے لے کر کلکتہ تک ادھر بمبئی سے لیکر مدراس تک اپنے خیالات کا پبلک کے سامنے اظہار کر سکتا ہے۔ اور لوگ اُس کی بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ گویا دیوناگری زبان پہلے سے ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ صرف اس کو تازہ حرکت دیکر چمکا دینے کی ضرورت ہے۔ مگر مسٹر ظفر کے نزدیک جو شاید دیوناگری کے حروف تہجّی سے بھی ناواقف ہونگے۔ دیوناگری زبان ایک مردہ زبان ہے۔ اسی لئے اُن کے خیال میں :-

"شمالی ہندوؤں کا اردو زبان کو نقصان پہنچانے کی خاطر ایک مردہ اور ردّی زبان کی سرپرستی کرنا ہندو مسلمانوں کے پہلے سے ہی بڑھے ہوئے تفرقہ کو دوچند سہ چند بلکہ ہزار چند زیادہ بڑھانے کا موجب ہوا ہے۔ ناگری کے حق میں رزولیوشن کا پاس ہونا اسی وقت سے اردو کے عاشقوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے"۔

جس طرح مسٹر ظفر کا آریہ بھاشا کو مردہ خیال کرنا محض وہم ہی وہم ہے۔ اسی طرح اُن کے "دل کا کانٹا" بھی محض فرضی کانٹا ہے۔ مگر آگے چل کر وہ کانگریس کی خبر لیتے ہیں :-

"اس میں شک نہیں۔ کہ بعض ہندو لیڈر کانگریس کے پلیٹ فارم پر سے ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا وعظ کرتے ہیں۔ مگر اس وقت تک اُن کے

اعمال اُن کے الفاظ کی مطابقت کرتے نظر نہیں آتے۔ اگر ہم اُن کے الفاظ کا اور اُن کی لچھے دار تقریروں کا افعال میں ترجمہ کریں۔ تو ہمیں اُن میں وہ ہمدردی نظر نہیں آتی۔ جو کہ اتحاد کے لئے ضروری ہے مسلمان بڑے دور اندیش ہیں کہ وہ کانگریس کی دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ جس حالت میں ہماری تعلیمی حالت بڑی ردّی ہے۔ ہمارا کانگریس میں شامل ہونا ہماری ہستی کو معدوم کر دینے کا موجب ہوگا۔ کیونکہ ہندوؤں کے گروہ کثیر کے ساتھ جو ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے اور جو تعلیم۔ دولت اور محنت کے لحاظ سے ہم سے افضل ہیں۔ ہمارا شامل ہو جانا نیستی کے برابر ہوگا +

آگے چلکر مسٹر ظفر نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ ہندو زبردست ہیں اور مسلمان کمزور ہیں۔ اس صورت میں دونوں کا ملاپ ایسا ہی ہوگا۔ جیسا کہ کوئی یورپ کا زبردست بادشاہ ایشیا کے ایک چھوٹے سے راجہ کے ساتھ عہدنامہ کرلے جب تک مسلمانوں کی حالت تعلیم اور دولت وغیرہ کے لحاظ سے ہندوؤں کے برابر نہ ہو جاوے تب تک مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ رہنے کی ضرورت ہے +

یہ ہیں مسلمانوں کے خیالات۔ ایسی صورت میں ہمارے لیڈروں کا یہ زور دیتے چلے جانا کہ مسلمانوں کو ساتھ لیکر چلنا چاہیئے۔ اس وقت تک کچھ پھل لائیگا۔ جب تک کہ مسلمان خود ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہونگے۔ مسٹر گوکھلے کا کہنا سچ ہے۔ کہ مسلمان تعلیم کے لحاظ سے بہت پیچھے ہیں۔ مسلمان اُس کمی خود محسوس کر رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں تعلیم عام نہیں ہوگی تب تک اُن کا ہندوؤں کے ساتھ ملکر کام کرنا بڑا مشکل ہوگا۔ کیونکہ تعلیم کے ذریعہ ہی اُن کے شکوک دور ہو سکینگے۔ مگر اندیشہ یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کی تعلیم کا فکر کرتے کرتے کہیں ہمارے لیڈر ہندوؤں کی طرف سے ہی لاپروا نہ ہو جائیں۔ کیونکہ ہندوؤں میں بھی تعلیم کی بڑی سخت کمی ہے۔ خاصکر اُن لوگوں میں جو کہ بقول مسٹر گوکھلے ہندو آبادی کا چوتھا حصہ ہیں۔ جو بالکل ذلت کی زندگی بسر کر رہے

ہیں۔ جن کے ساتھ چھونے تک بھی ہندو لوگ پاپ سمجھتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی آبادی چھ اور سات کروڑ کے درمیان ہے۔ تو ایسے لوگوں کی آبادی جن کو جانوروں سے بھی بدتر خیال کیا جاتا ہے۔ ۵ کروڑ سے کم نہیں ہے۔ اگر ان ادنے درجہ کی قوموں کو تعلیم سے بہرہ ور کر دیا جاوے۔ تو اُس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم نے اپنے اندر ایک "نیا جاپان" جذب کر لیا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی آبادی جاپان کی آبادی سے بھی بڑھکر ہے۔ سوچو اگر ہندو آبادی کا چوتھائی حصہ جو کہ اس وقت حیوانوں سے بھی بدتر حالت میں پڑا ہے۔ انسان بنا دیا جاوے۔ تو ملک میں کس قدر انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ مہاراجہ گائیکواڑ نے کلکتہ میں انڈسٹریل کانفرینس میں تقریر کرتے ہوئے بڑے زوردار الفاظ میں اس بات پر زور دیا تھا۔ کہ نوجوانو! نیچ قوموں کو اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرو۔ مسٹر گوکھلے کی تقریر کے بھی آخری الفاظ یہی ہیں۔ کہ افریقہ کا معاملہ ہمارے گھر میں موجود ہے۔ پہلے اُس کو حل کرنا چاہئے"۔

ہمارے خیال میں جب تک نیچ قوموں کے "مردہ بوجھ" کو زندہ نہیں کیا جاویگا۔ تب تک ہندوستان آریہ ورت نہیں بن سکیگا۔ مسلمان بھی اسی وجہ سے پستی کی حالت میں پڑے ہیں۔ کہ اُن کے ہاں بھی اس قسم کی قوموں کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ جب تک ہندو اور مسلمان دونوں مل کر پاؤں کے نیچے کچلے جانے والوں کو انسانوں کا مرتبہ نہیں دینگے۔ تب تک ان کروڑہا مظلوموں کی آہوں کا دھوآں آسمان پر پہنچکر بادل کی شکل اختیار کر کے ترقی کے سورج کی کرنوں کو برابر روکے رکھیگا ٭

گوروکل کانگڑی

کا سالانہ جلسہ گذشتہ ماہ مارچ کے آخری ایام میں نہایت کامیابی سے ختم ہوٴا منتظمان نے یاتریوں کی تعداد کے اندازہ کرنے کے لئے جو معیار مقرر کیا تھا۔اس سے ساٹھ ہزار کی تعداد کا تخمینہ کیا گیا ہے۔بلحاظ چندہ کے بھی یہ جلسہ کچھ کم کامیابی سے ختم نہیں ہوٴا۔ ۴۵ ہزار کے قریب نقد اور پندرہ ہزار کے قریب کا وعدہ تبلایا جاتا ہے۔متواتر ۳ روز تک بھجن اور اپدیشوں سے ہزاروں آدمی مستفیض ہوتے رہے۔آریہ پرشوں کو باہمی میل ملاپ کرنے اور ضروری مسائل پر ملکر وچار کرنے کا موقعہ بھی ملا۔آریہ سماج کی ہستی کا اندازہ لگانے والوں کے لئے ویدک دھرم کی عظمت کو سمجھنے والوں کے لئے اور گوروکل طریقہ تعلیم کی خوبیوں کو جاننے والوں کے لئے جن امیدوں کا مرکز اس جلسہ کو خیال کرکے اس قدر کثیر تعداد میں نرو ناری وہاں اکھٹے ہوئے۔جلسہ کی کامیابی سے ظاہر ہے۔کہ وہ اپنی امیدوں کو پورا ہوتا دیکھکر بہت کچھ اُتساہ اور سیوا کرنے کے خیالات کو لیکر واپس آئے ہیں۔کیا ہی اچھا ہو۔اگر باقاعدہ سال بھر اس انسٹی ٹیوشن کے لئے لگاتار کوشش کی جاوے۔اور لوگوں کی ہمدردی سے عملاً فائدہ بھی اُٹھایا جاوے +

خوفناک غفلت

جب کسی شہر میں کسی بیگناہ کا قتل ہو جاتا ہے یا کسی بے قصور کو کسی مفروضہ جرم کے مرتکب ہونے کے خیال سے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔تو تمام شہر بلکہ صوبے میں غیر معمولی

شورش سنائی دینے لگتی ہے۔ عوام کے جذبات کو اُکسانے اور اُن سے بلا واسطہ یا بالواسطہ فائدہ اُٹھانے کے لئے پریس کی متفقہ طاقت یکبارگی اُدھر ہی صرف ہونے لگتی ہے۔ کوئی دیر کا واقعہ نہیں۔ کہ روس وجاپان کے خوفناک جنگ میں چند لاکھ آدمیوں کی قیمتی زندگیاں تلف ہو جانے پر چاروں طرف سے ہمدردی اور افسوس کا اظہار ہوتا تھا۔ بدقسمت ہندوستان کی حالت ہی دگرگون ہے۔ جہاں کی زمین ہی نیاری ہے۔ اس ملک کے باشندے بھی کچھ عجیب قسم کے احساس کے انسان ہیں۔ گورنمنٹ ملک بھی کچھ انوکھی چال چل رہی ہے۔ لاکھوں انسان آئے سال مر رہے ہیں۔ اُف تک نہیں کی جاتی۔ میونسپلٹیاں نامعلوم کس مرض کی دوا ہیں۔ کہ اُن کے کارکنان خواب غفلت میں لمبی تان رہے ہیں۔ امسال گذشتہ سالوں سے بڑھ چڑھکر اموات کی تعداد کا شمار کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے دیگر صوبوں کی حالت کو چھوڑ کر اگر پنجاب پر ہی سرسری نظر ڈالی جاوے۔ تو ۵۰ ہزار کے قریب ماہواری اموات کی کثیر التعداد کا ظاہر کیا جانا کچھ کم خوفناک نہیں۔ اس وقت پنجاب کے مغربی حصے کو چھوڑ کر قریباً سب بڑے بڑے شہروں میں نامراد پلیگ کا زور ہے۔ خاص لاہور میں سو سو یا زیادہ روزانہ اموات کا شمار کیا جانا بذات خود خوفناک امر ہے۔ جالندھر۔ لدھیانہ۔ گورداسپور۔ انبالہ وغیرہ سب بڑے شہروں میں پلیگ کی کثرت ہوتی جا رہی ہے۔ جہالت اور لاعلمی کے باعث عوام کو یقین دلایا جاتا ہے۔ کہ یہ لاعلاج مرض ہے۔ جس کی موت آچکی ہے وہ بچ نہیں سکتا۔ گورنمنٹ وقت کا لوگوں کی ہمدردی کیلئے توجہ نہ دینا جہاں قابل افسوس ہے۔ وہاں پبلک میں کام کرنیوالے نیکدل انسانوں کی عدم موجودگی بھی کچھ کم حیرت بخش نہیں۔ گذشتہ موقعہ پر جب پونا میں ۱۵۰ کے قریب روزانہ اموات کی تعداد شمار کی گئی تھی۔ پونا یکدم خالی کر دیا گیا تھا۔ لیکن لاہور میں باوجود پونا سے کم آبادی ہونے کے اُسی قدر تعداد کے پہنچنے پر بھی کچھ عوام

کو توجہ نہیں دلائی گئی۔ کیا ضرورت نہیں۔ کہ گورنمنٹ کی جانب سے معقول تعداد میں ڈاکٹر مقرر کئے جاویں۔ جن کا فرض ہونا چاہئے۔ کہ لوگوں کو اُن کے گھروں میں جاکر بچاؤ کی صورت اختیار کرنے کے لئے ہدایات بتلاویں۔ عوام میں بیماری کی اصلیت اور صورت کو جتلا کر شہر کو چھوڑ دینے کی ترغیب دیں کیا گورنمنٹ کا فرض نہیں۔ کہ شہروں کے نزدیک زمین صاف کرواکر عوام کو گھاس پھوس وغیرہ سامان مہیا کریں۔ تاکہ وہ شہر کی گندی ہوا سے آزاد ہوکر باہر چھپر بنوالیں۔ اور چند ماہ باہر رہکر گزاریں۔ کیا یہ ضروری امر نہیں کہ عوام کو یقین اور تسلی دلائی جاوے۔ کہ حفاظت کے لئے شہر سے باہر جنگل میں جھونپڑوں کے اندر رہنے پر اُن کے جان و مال کی پوری پوری حفاظت کی جاویگی۔ جس کی وجہ سے وہ موت کو ترجیح دیتے ہوئے شہروں کی گندی گلیوں کے اندر پلیگ کا شکار بن رہے ہیں۔ گورنمنٹ کی بے اعتنائی اور میونسپل کمیٹیوں کی لاپرواہی کو جانے دیجئے۔ اس قدر سماجوں۔ سبھاؤں اور انجمنوں کی موجودگی کے باوجود لوگوں کی خدمت کے لئے باقاعدہ سیوکوں کا مقرر نہ کیا جانا نہایت ہی افسوسناک نظارہ ہے۔ شہروں میں اس قدر باہمی ہمدردی کی عدم موجودگی دیکھی جاتی ہے۔ کہ لاشوں کو شمشان بھومی میں لے جانے والے بھی نہیں ملتے۔ چہ جائیکہ بیماری میں گرفتار مریض کے سرھانے بیٹھکر اُن کی تیمارداری کی جاوے۔ ہمیں تعجب معلوم ہوتا ہے۔ کہ کیوں فادر ڈیمین کی مثال کی پیروی کرنے والے رحمدل عیسائی پادری اس موقعہ کو ہاتھ سے کھو رہے ہیں۔ زندگی سے بڑھکر کوئی چیز انسان کو عزیز نہیں۔ دھرم کا دھیان کرنا تھوڑے منشوں تک محدود رہتا ہے۔ اگر ایسے موقعوں پر وہ مریضوں کی خدمات بجا لاویں۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ عیسے کی بھیڑوں کی تعداد بڑھانے میں اُنہیں کیوں خاطرخواہ کامیابی نہ ہو۔ ہندوؤں میں جہاں یہ غلط خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے۔ کہ پرماتما کی جانب سے یہ
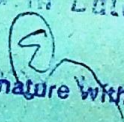
مرض پھیلا ہے۔جس کی عمر ختم ہو چکی۔ وہی مرینگے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہاں
مسلمانوں میں بھی ضعیف الاعتقادی کا گہرا اثر موجود ہے۔ حکم الٰہی تصور
کرتے ہوئے ہزاروں آدمی روزانہ موت کے بھنیکر چنگال میں گرفتار کئے
چلے جا رہے ہیں۔اگر یہ حالت جاپان جیسے کسی مہذب ملک میں ہوتی۔ تو
نہ معلوم دنیا کی رہبری کے لئے کس قدر نئی معلومات اور ضروری ہدایات
کا قیمتی خزانہ عوام تک پہنچایا جاتا۔ بیماری دنوں دن زور سے بڑھتی جا
رہی ہے۔ ہر ہفتہ اموات کی تعدادیں ترقی ہوتی نظر آتی ہے۔ ایک ماہ
کے اندر سوا لاکھ یا ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کا مر جانا کیا درحقیقت ایسا خفیف
سوال ہے۔ جس کی جانب پوری پوری توجہ کی ضرورت نہیں۔ روس
اور جاپان کی لڑائی میں ۶-۷ لاکھ انسانوں کی زندگیاں تلف ہوئی
تھی۔یہاں ۴ ماہ کے اندر ۶-۷ لاکھ زندگیاں تلف ہو جاوینگی۔ اُن
انسانوں کے لئے ایک دنیا افسوس کرتی تھی۔ ان کے لئے اب رشتہ دار
تک نہیں روتے۔ جہاں پلیگ ہوئی۔ مریض مرا۔ چپکے سے شمشان
بھومی میں پہنچا کر واپس آ گئے۔ ہم کہ رہے تھے۔ کہ ایک انسان کے
قتل ہو جانے پر یا کسی بے گناہ آدمی کے مارے جانے پر جس قدر
شور و شر ہوتا ہے۔ اُس کا عشر عشیر بھی لاکھ انسانوں کے پلیگ سے
تلف ہو جانے پر نہیں ہوتا۔ کیا یہ دردناک اور خوفناک نظارہ نہیں۔
کہ پریس کی طاقت نے اس سوال کی اہمیت کو محسوس تک
نہیں کیا +

مصر میں جوش

ہندوستان کی طرح مصر بھی انگریزوں کے
زیر تحت ہے۔ مغربی تہذیب۔ انگریزی تعلیم۔
قومی ہمدردی اور ضروریات کے احساس اور تجارتی خیالات سے متحرک
ہو کر مصر کے لوگوں میں بیداری کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس ملک کی نیشنلسٹ پارٹی